میر تقی میرؔ
کے
ادبی معرکے

نوید عشرت کے نام

جس کی یادوں کے چراغ ہمیشہ روشن رہیں گے

فہرست

تعارف

ادبی معرکوں کی بنیاد معاصرانہ چشمک پر ہوتی تھی۔ ایک شاعر دوسرے شاعر کے کلام پر منظوم اعتراض کرتا دوسری طرف سے ان اعتراضوں کا جواب دیا جاتا۔ باقاعدہ فن تنقید کی عدم موجودگی میں یہ رجحان یقیناً صحت مند تھا۔ اسی لیے اردو تنقید کے ارتقا کا جائزہ لینے کے لئے ادبی معرکوں میں لکھی جانے والی ہجویں بھی اہم ترین آخذ ہیں۔ لیکن ستم یہ ہوا کہ ان معرکوں میں دونوں شاعروں کے لاتعداد شاگرد اور مداحین شامل ہو کر باقاعدہ فریقوں کی صورت اختیار کر لیتے۔ ادبی اعتراضات ختم ہو جانے پر دونوں فریق ذاتیات پر اتر آتے اور ایک دوسرے کو ایسی ملاحی سناتے کہ بس۔ بعض اوقات مشاعرے میدان کارزار بن جاتے جہاں دونوں فریق ہتھیاروں سے لیس ہو کر آتے۔ یہ مشاعرے ایسی صحبتیں بن جاتے جن میں "آخر جانیں بھی جاتیاں ہیں" ایک ادبی معرکے میں خواجہ میر درد کے شاگرد محشر کو تہلکت شاگرد جرأت نے قتل کر دیا تھا۔ بعد میں محشر کے خاندان والوں نے دہلت کی جان لے کر بدلہ چکایا۔

شاعرانہ تعلّی بھی بعض اوقات ادبی معرکے کی محرّک ہوتی، ایک شاعر دعویٰ کرتا "دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا" اور دوسرا شاعر سہرا کہہ کر جواب دیتا "دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا"

میر تقی میر بھی ایسی شاعرانہ تعلّی سے کام لیتے تھے۔ وہ غالباً انتہائی

ایمانداری سے خود کو انذر اور ہم عصر شاعروں کو "حقیر کیڑے" سمجھتے تھے۔ میر کے اس رویے سے ان کے اکثر ہم عصر نالاں ہیں۔ امان اللہ خاں نثار نے تو تہذیب و ادب کو بالائے طاق رکھ کر اس انداز سے جواب دیا تھا۔

حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

میر کے خدائے سخن ہونے میں کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن میر کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت، نازک مزاجی بلکہ بد دماغی کا کوئی جواز نہیں۔ وہ سماج کے ایک فرد پہلے تھے اور پھر شاعر۔ میں نے جو کچھ عرض کیا اُسے محمد حسین آزاد نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح کہا ہے "میر صاحب کی بلند نظری اس غضب کی تھی کہ دنیا کی کوئی بڑائی اور کسی شخص کا کمال یا بزرگی انھیں بڑی نہ دکھائی دیتی تھی"۔

ہر عہد میں نہ جانے کتنے فنکار میر کی طرح اپنی "فنی" عظمت کے دعویدار ہوتے ہیں۔ ان میں اول درجے کے تو خیر چھوڑ دیتے دوسرے اور تیسرے درجے کے بلکہ ایسے فنکار بھی شامل ہوتے ہیں جن کی شہرت صرف مقامی ہوتی ہے۔ اور ساری زندگی گمنامی کا شکار رہتے ہیں۔ ناقدری زمانہ کی شکایت تو شاید ہر چھوٹے اور بڑے فنکار کی قسمت میں لکھی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے فن کی بدولت جو لوگ سونے اور چاندی میں تلے ہیں انھیں بھی یہ شکایت رہی ہے۔ میر کو یہ حق تو ہے کہ وہ خود کو اپنے عہد کا عظیم ترین شاعر سمجھیں لیکن یہ حق نہیں ہے کہ اپنے ہم عصروں کو "حقیر کیڑا" کہیں۔ میر ایک عظیم شاعر تھے، لیکن عظیم انسان نہیں تھے۔ ان کی شخصیت کا وہ تاریک ترین پہلو ان کی وہ ادبی سازش تھی جس کا شکار انعام اللہ خاں یقین اور مرزا مظہر اسکول کے دوسرے شاعر ہوئے۔ میر نے یقین کے سارے شعری سرمائے کو ان سے چھین کر ان کے استاد مرزا مظہر کے

دامن میں ڈال دیا تھا۔ یقین کسی بھی صورت میں میر سے بڑے شاعر نہیں تھے لیکن ایک ادبی تحریک کے فروغ کی وجہ سے جب تک وہ زندہ رہے۔ انھیں میر پر فوقیت حاصل رہی۔ یقین سے میر کی مخاصمت کی یہی وجہ ہے۔ اگر فرحت اللہ بیگ انکا دیوان نہ مرتب کرتے تو یقین اور نہ جانے کب تک میر کی ستم ظریفی کا شکار رہتے۔

میر غزل میں ایک قانع، خوددار اور قحبۂ دنیا سے گریزاں درویش نظر آتے ہیں، لیکن ہجووں میں ان کی شخصیت کے وہ پہلوا جاگر ہوئے ہیں جو لائق تحسین نہیں۔ میر کے ادبی معرکوں کا مطالعہ دراصل میر کی شخصیت کے ایسے ہی پہلوؤں کا مطالعہ ہے۔ محمد یعقوب صاحب نے پہلی بار ان ادبی معرکوں کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے ابتدا میں بڑی محنت اور جستجو سے ادبی معرکوں کے اسباب بیان کئے ہیں۔ اور بتایا ہے کہ اردو ادب میں ادبی معرکوں کی کیا روایت رہی ہے۔ یعقوب صاحب میر کے مداح ہیں لیکن منصف مزاج بھی ہیں۔۔۔ انھوں نے میر کی شخصیت کے دونوں ہی پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے۔

اگر کسی شاگرد کی خوش نصیبی یہ ہے کہ اُسے اچھا استاد مل جائے تو استاد کے لئے بھی یہ بات کچھ کم باعث مسرت نہیں کہ اسے ذہین اور محنتی شاگرد سے سابقہ پڑے میں یعقوب صاحب کے معاملے میں خود کو ایسے ہی خوش نصیب استادوں میں شمار کرتا ہوں، وہ بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لے کر اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔

یہ کتاب یقیناً میریات میں ایک اہم اضافہ ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم

پیش لفظ

میر تقی میر اردو کے بڑے بانکے ترچھے اور محبوب شاعر ہیں ان کی شاعری میں رس اور ان کی شخصیت میں عجیب دل آویزی ہے۔ کبھی اپنے بارے میں لکھا ہے کہ "پاؤں کے نیچے کی مٹی بھی نہ ہوگی ہم سی" اور کبھی اسکا اعتراف کیا کہ "از بس کہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار" لطف یہ ہے کہ یہ وہی میر ہیں جو انسانی عظمت کے رجز خواں بھی ہیں اور اس کی بے بضاعتی اور مجبوری کے ماتم گسار بھی، مگر ان کے علاوہ میر کی ایک اور شخصیت بھی ہے۔ وہ سرگوشیوں میں دردمندی کی باتیں کرنے والے شاعر کی نہیں ایک ایسے حساس اور کڑوے کسیلے انسان کی ہے جو اپنی معمولی سی تنقید بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ شخصیت ان کے ادبی معرکوں میں سامنے آئی ہے۔

ادبی معرکے یوں تو ہمیشہ افسوسناک ہوتے ہیں کیوں کہ عموماً فریقین کا اسفل ترین حصہ ان معرکوں میں اظہار پاتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ اس وسیلے سے کبھی ادب اور ادیب کی بہت سی پرتیں کھلتی ہیں اور اسی لئے ادب کے طالب علم کو تلخی اور زہرناکی سے معمور اس کوچے کی راہ کبھی اختیار کرنی ہوتی ہے، اور وہ کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل جانے پر مجبور ہوتا ہے۔

محمد یعقوب صاحب کو جتنا میں جانتا ہوں معرکہ آرائیوں سے بچنے والے بلکہ رشید احمد صدیقی صاحب کے لفظوں میں، توبۃ النصوح قسم کے آدمی ہیں۔ لیکن

ادبی معرکوں پر ان کا یہ کام معرکے کا ہے۔

ابھی تک تاریخ ادب میں ان معرکوں کے تذکرے تو تھے لیکن ان کا باقاعدہ مطالعہ پہلی بار کیا گیا ہے، انھوں نے ان ادبی معرکوں کے عوامل و محرکات، شخصیات و واقعات اور اس ضمن کی تخلیقات و تصنیفات کا تجزیہ خوبی سے کیا ہے جس کے لئے وہ تہنیت کے مستحق ہیں، مجھے امید ہے کہ ان کی یہ پہلی کاوش ادبی حلقوں میں قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ اور اس پذیرائی سے انھیں آئندہ بہتر علمی کاوشوں کے لئے حوصلہ ملے گا۔

ڈاکٹر محمد حسن

دہلی

۳ر اکتوبر ۱۹۷۰ء

ابتدائیہ

زیر نظر مقالہ محمد یعقوب صاحب کا پُرلطف اور دلچسپ نتیجۂ فکر ہے
[illegible] یعقوب صاحب ایک
خاموش، سادہ مزاج اور سنجیدہ طبیعت انسان ہیں، مگر اپنے مقالے کے واسطے
موضوع کا انتخاب کرنے میں انھوں نے خاصی شوخی سے کام لیا ہے۔ "ادبی
معرکے" سے مراد وہ نوک جھوک ہے جو دو ادیبوں یا شاعروں میں قدرۃً
پائی جائے۔ مگر سچ پوچھئے تو اس کے ذیل میں تمام تفضیح و تعریض، لعن طعن
سبّ و شتم اور جنگ و جدال آجاتی ہے جس کا ہونا ایسے مواقع پر ناگزیر
ہے اور جس کی مثالیں موجودہ مقالے میں بکثرت ہیں۔

عربی ادب میں جریر اور فرزدق کے معرکے مشہور ہیں۔ بعض دوسرے
شعرا نے بھی اس طرف توجہ کی۔ مگر جہاں تک ہمیں خیال ہے ان کی شاعری
میں فحش گوئی کا دخل کم ہے۔ نمیر عرب کا ایک معزز قبیلہ تھا۔ جریر کو ایک
نمیری سے کوئی رنج پہنچا۔ چنانچہ دل کھول کے اس کی ہجو کی۔ جب اس شعر پر پہنچا

فغض الطرف انک من نمیر ‖ فلا کعباً بلغت ولا کلابا

یعنی اپنی آنکھیں نیچی کر کہ تو قبیلہ نمیر سے نسبت رکھتا ہے۔ تیری یہ حیثیت

کہاں کہ تو کعب اور کلاب (دو قبیلے) کے درجے کو پہنچے تو بے ساختہ پکار اٹھا واللہ اخزیتہ آخرالدہر (بخدا میں نے اس کو ہمیشہ کے لئے ذلیل کر دیا) اور جیسا کہ اس نے کہا تھا وہی ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شاعر نے کسی امیر کی ہجو کی۔ اسی میں ذیل کا شعر تھا۔

دع المکارم لا ترحل لبغیتها   واقعد فانک انت الطاعم الکاسی

(مکارم اخلاق کا خیال چھوڑ۔ ان کے حصول کے لیے کہیں جانا بیکار ہے۔ چین سے گھر بیٹھ کیونکہ تجھے تو کھانے پہننے سے مطلب ہے) اس شعر کے بارے میں اہل ادب کا بیان ہے کہ یہ ہجو کی تلخی اور شدت کے لحاظ سے لاجواب ہے۔ اسی بنا پر بعد کے ناقدین نے کہا کہ مذمت کرنے میں کسی شخص کی سیرت کے صرف وہ پہلو پیش نظر رکھے جائیں جو سوسائٹی میں واقعی معیوب ہیں۔ اور جسمانی نقائص یا خاندانی کمزوریوں کے ذکر سے پرہیز کیا جائے۔

ایران میں آکر یہ لے اور زیادہ تیز ہوگئی۔ اور نامور ذی علم شعرا نے ایک دوسرے کی تذلیل میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ ہر بے ہودگی جائز اور ہر ناگفتنی گفتنی بن گئی۔ چنانچہ رشید وطواط، ابوالعلا گنجوی، حکیم خاقانی حکیم انوری، سوزنی، کمال اصفہانی، شیخ سعدی، عبید زاکانی، حکیم شفائی نعمت خاں عالی۔ حکیم قاآنی کے کارناموں سے کون واقف نہیں۔

اردو میں ولی اور ناصر علی میر و سودا۔ مصحفی و انشا۔ ناسخ و آتش وغیرہ کے معرکے شوخی اور ہزل سے بھرپور اور تاریخ ادب میں مذکور ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں یہ امر موجب اطمینان ہے کہ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا شعرا کی ادبی نوک جھونک میں کمی اور طریقۂ تخاطب میں متانت اور شائستگی آتی گئی۔ پہلے سوسائٹی کی بے قیدی اور درباروں کی بد مذاقی

کی بدولت جو کچھ بھی ہوا سو ہوا۔ مگر بعد کے حالات میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ اساتذہ نہ صرف طعن و تشنیع سے اجتناب کرتے بلکہ بڑی حد تک اپنے معاصرین کا دکھ رکھاؤ ملحوظ رکھتے تھے۔ غالب و مومن۔ داغ و امیر تسلیم و جلال کے باہمی روابط ہمارے دعوے کا ثبوت ہیں۔

یعقوب صاحب نے بڑے سلیقے سے اس مقالے کو ترتیب دیا اور اس سلسلے میں ہر ممکن ماخذ سے کام لیا ہے۔

ان ادبی لطائف میں کہیں کہیں قیمتی موتی تھے جو ظرافت کی کیچڑ میں گر کر دھندلے ہو گئے تھے۔ مرتب نے ان کو صاف کر کے اہل نظر کے سامنے پیش کیا ہے۔ بقول سعدیؒ۔

جوہر اگر در خلاب افتد ہماں نفیس است و غبار اگر بر فلک رود ہماں خسیس۔

پروفیسر ضیا احمد بدایونی

۱۵ مئی ۱۹۸۱ء

تمہید

میر تقی میر کو خدائے سخن اور شہنشاہ متغزلین کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب شاعر ہو جسے ہر عہد میں میر کی طرح مقبولیت حاصل رہی ہو۔ اس حقیقت کو بھی آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ غالب جیسے خود بین و خود آرا شاعر نے اردو کے جس ایک شاعر کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے وہ میر ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ایک غزل میں انھوں نے ناسخ کا یہ مصرع دہرایا ہے۔

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

آج بھی میر کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہمارے شاعر ان کے انداز میں شعر کہنے پر فخر کرتے ہیں۔ فراق گورکھپوری، ابن انشا، خلیل الرحمن اعظمی وغیرہ نے میر کے دھیمے اور نرم لب و لہجے کا تتبع کیا ہے اور ان کی طرز کو اپنانے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ اس مقبولیت اور شہرت کے باوجود میر پر ہمارے محققین اور ناقدین نے وہ توجہ صرف نہیں کی جس کے وہ مستحق ہیں۔ میر پر صرف دو کتابیں قابل قدر ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی میر تقی میر — حیات اور شاعری اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی نقد میر۔ لیکن میر جیسے عظیم فنکار کے ساتھ یہ دو کتابیں کسی بھی طرح انصاف نہیں کر سکتیں۔ ابھی میر کی شخصیت اور فن کے بے شمار گوشے تشنہ ہیں۔

ہمارے موضوع "میر کے ادبی معرکے" میں بظاہر میر کی معاصرانہ چشمکوں کی داستان ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادبی معرکے چھیڑ چھاڑ، لعن طعن اور ہجو گوئی سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہیں۔ یہ شاعر کی شخصیت، اس کے اخلاق اور ہم عصر سماج سے اس کے رشتے پر روشنی ڈالتے ہیں۔ شاعر اخلاقی طور پر جن چیزوں کو برا سمجھتا ہے۔ ان معرکوں میں اکثر ان ہی عیوب کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ انھیں معرکوں سے ہمیں اپنے شاعروں اور ادیبوں کی اخلاقی کمزوریوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اپنے پیش رو اور بزرگ فنکاروں کے ساتھ سب سے بڑا انصاف یہ ہے کہ ہم ان کے متعلق تمام حقائق بغیر کسی کمی بیشی کے پیش کر دیں۔

انھیں ادبی معرکوں سے ہم اپنے فنکار کے تنقیدی شعور کا بھی جائزہ لے سکتے ہیں۔ کیوں کہ ان میں عام طور پر ایک دوسرے کے کلام پر اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ چونکہ ان معرکوں میں کوشش ہوتی تھی کہ عوام سے زیادہ سے زیادہ داد و تحسین حاصل کی جائے۔ اس لیے شاعر اپنی تمام صلاحیتوں کا استعمال کرتا تھا۔ ممکن ہے وہ ہجویں جو ان ادبی معرکوں میں لکھی گئی ہیں، تہذیبی اور اخلاقی اعتبار سے پست ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں بعض ہجویں فن شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔

ہم نے میر کے ادبی معرکوں، کا یہاں اسی پس منظر میں جائزہ لیا ہے۔ اس مقالے میں سب سے پہلے ادبی معرکوں کا مفہوم اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد 'اردو شاعری میں ادبی معرکوں کی روایت' کا جائزہ لیا گیا

ہے۔ جو محض ہندوستانی معاشرت کا ہی نتیجہ نہ تھی بلکہ اس قسم کی عربی اور فارسی کی قدیم روایتوں کی ایک کڑی تھی۔

آخر میں میر کے مزاج کا تجزیہ کرکے ان کے ادبی معرکوں کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ لیکن ہم نے ہر ایک معرکے میں تحقیقی نتائج کم تنقیدی مطالعہ کیا ہے اس مطالعے سے میر کی شخصیت کے بہت سے پہلو واضح ہوتے ہیں اور اس کے فن کو سمجھنے کے لیے بہت سی نئی راہیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان معرکوں میں جو ادب ظہور میں آیا ہے۔ اس پر بھی تنقیدی نظر رکھی گئی ہے۔

میں محترمی ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس مقالے کی تیاری میں مجھے قدم قدم پر اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور بھرپور تعاون دیا۔ اس کے علاوہ صاحب موصوف نے اس مقالے کی تکمیل پر جس طرح اپنی دلی مسرت کا اظہار فرماکر میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ میرے دل پر اس کا نقش ہمیشہ رہے گا۔

میرے کرم فرما جناب امیر حسن نورانی صاحب کی یہ محبت ہے کہ انھوں نے میرے اس مقالے کو [illegible] مبالغہ کی حد تک پسند فرمایا اور پھر اس کی طباعت و اشاعت کی بھی تحریک کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ان کا یہ پرخلوص جذبہ کارفرما نہ ہوتا تو شاید یہ مقالہ اتنی جلد کتابی صورت میں منظر عام پر نہ آتا۔

محمد یعقوب
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی
دہلی،
۱۵ر ستمبر ۱۹۷۰ء

ادبی معرکہ کا مفہوم

قاضی ظہور الحسن ناظم نے اپنے ایک مضمون "ہجوگوئی کی تاریخ" میں لکھا ہے۔

"اکثر صاحبانِ فن میں چشمک ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض میں تو منافست ہوتی ہے اور بعض میں نفسانیت ہوتی ہے۔ قسم اول کا معاملہ تو اشاروں، کنایوں اور ذرکی نوک جھوکی پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے خفیف معاملات ہوتے ہیں کہ ان کو اکثر مورخ اور تذکرہ نویس بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ قسم دوم کا معاملہ طوالت پکڑ جاتا ہے۔ اول نوک جھوک ہوتی ہے پھر ہجو ملیح، پھر ہجو قبیح پھر سب و شتم تک نوبت پہنچ جاتی ہے ؎

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی
آپ سے تم، تم سے تو ہونے لگی

بعض دفعہ ہاتھا پائی بھی ہوئی ہے بلکہ خون خرابے بھی ہوئے ہیں۔"[1]

ادبی معرکہ کا عام مفہوم بھی یہی ہے۔ یعنی اس میں معاصرانہ چشمک

---

[1] محمد طفیل، نقوش طنز و مزاح نمبر ۱، ۲، لاہور، فروری ۱۹۵۹، ص ۹۶

کی معمولی چھیڑ چھاڑ سے ے کر دانی حملوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔
ہم ادبی معرکے کی حدود قائم کرنے کے لیے اس تبدیلی کے دو مرے دو لفظوں کی تشریح اور کریں گے۔ وہ ہیں ادبی مقابلہ اور ادبی مباحثہ۔
ادبی مقابلہ اس کو کہتے ہیں کہ جب فریقین ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنی تخلیقات پیش کریں یا کسی ایک موضوع پر اظہار خیال کریں — یا اشعار کہیں۔ ان مقابلوں میں جج کو فیصلہ کا اختیار ہوتا ہے۔ اور اسی فیصلے کے مطابق کسی فریق کو کامیاب تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال ہمیں عربی ادب کی تاریخ کے ابتدائی دور میں بھی ملتی ہے۔ عرب میں دو بازار تھے۔ عکاظ اور ذوالمجاز، ان بازاروں میں گرد و نواح سے مشہور شاعر ادبی مقابلے میں حصّہ لینے کے لیے شریک ہوتے۔ ایک دوسرے کے مقابلے میں فی البدیہہ اشعار کہتے اور یہ کوشش کرتے کہ ایک دوسرے سے سبقت لے جائیں۔ حکم ان میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ دیتا اور اسی فیصلے کے مطابق وہ عرب کا بڑا شاعر تسلیم کر لیا جاتا۔
ادبی مباحثہ اس سے ذرا مختلف ہے۔ اس میں فریقین کسی ایک موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ اور اس کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لا کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں یہ بھی ممکن ہے کہ فریقین بعض نتیجوں پر متفق ہو جائیں اور اس بات کے بھی امکانات ہوتے ہیں کہ فریقین کے خیالات میں اختلافات بدستور قائم رہیں۔ مباحثہ کے دوران ہر فریق اپنے زاویہ نگر کی تائید میں اپنے دلائل پیش کرتا ہے۔ اور اس طرح مختلف اور متضاد خیالات کے اظہار کے بعد یہ مباحثہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ مباحثہ اخبار و رسائل کے ذریعہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور

کسی ایک جگہ اکٹھا ہو کر بھی۔ جس کی مثال آج کل کے سیمنار ہیں۔
ہم نے دیکھا کہ ادبی مقابلے اور ادبی مباحثے میں فریقین کے سامنے ادب کا کوئی ایک خاص موضوع ہوتا ہے اور اس پر ایک دوسرے کے مقابلے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ان کے اپنے دلائل ہوتے ہیں۔ جن میں اختلافِ رائے بھی ہوتا ہے اور ایک دوسرے سے متضاد خیالات بھی سامنے آتے ہیں۔ لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھتی۔ ادبی مقابلے کا اختتام حکم کے فیصلے پر ہو جاتا ہے اور ادبی مقابلے کا اختتام فریقین کے اظہارِ خیال کے بعد۔ رہا اختلافات کا سوال۔ یہ اختلافات موضوع کے ساتھ ہوتے ہیں جو آپس کے تعلقات میں حائل نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور یہی ان کی افادیت بھی ہے۔

ادبی معرکوں میں فریقین ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں۔ اور یہ صف آرائی محض ادبی حدود تک ہی قائم نہیں رہتی۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ذاتی بغض و عناد کی حدوں میں بھی داخل ہو جاتی ہے۔ ذاتیات پر حملے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی عیب جوئی کی جاتی ہے اخلاقی اور جسمانی کمزوریوں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ ایک دوسرے پر الزام لگائے جاتے ہیں۔ مطعون کیا جاتا ہے۔ دست و گریباں بھی ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی کشت و خون کی بھی نوبت آ جاتی ہے۔ ادبی معرکوں کے مطالعے میں یہ سب چیزیں شامل ہیں اور انھیں شامل

٭ ان سب کی مثالیں اور حوالے ہم نے آگے چل کر "اردو میں ادبی معرکوں کی روایت" میں پیش کیے ہیں۔

ہونا بھی چاہئے ۔ کیوں کہ ان سے ایک خاص قسم کا ادب وجود میں آتا ہے ۔ وہ ادب جو مصنّف کی اس شخصیت کو اجاگر کرتا ہے جو فن کی عظمت میں دب کر رہ جاتی ہے ۔ لیکن جس کا تجزیہ اس کی شخصیت اور مزاج کو سمجھنے میں سب سے زیادہ اہم ہے ۔

عام معرکہ آرائی تو اس وقت شروع ہوتی ہے جب فریقین ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں ۔ یا پھر اپنی مدافعت میں ایک دوسرے کا حملہ روکتے ہیں ۔ ادبی معرکے میں کبھی فریقین ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں مگر یہاں وہ لاٹھی اور تلوار سے کام نہیں لیتے ۔ ادب کو اپنا ہتھیار بناتے ہیں ۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا انجام بھی لاٹھی اور تلوار کی صورت میں ظاہر ہو ۔

ادبی معرکوں کی مختلف صورتوں کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔

ادبی معرکوں کی سب سے مکمّل صورت وہ ہے جب دونوں فریق ایک دوسرے پر حملہ آور بھی ہوں اور ایک دوسرے سے اپنی مدافعت بھی کر رہے ہوں ۔ اس کی مثال معرکہ مصحفی و انشا ہے ۔ مصحفی اور انشا ایک دوسرے کے کلام کی تنقیص بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے اعتراض کا جواب بھی دیتے ہیں ۔

دوسری شکل یہ ہے کہ حملہ آور صرف ایک ہی فریق ہو۔ اس کی دو صورتیں ممکن ہیں۔

اوّل یہ کہ فریق ثانی واقعی خاموش ہو گیا ہو۔ یا تو اس نے فریق اوّل کو قابل اعتنا نہ سمجھا یا اس کو اس کے مقابلے پر آنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

دوم یہ کہ فریق ثانی نے اپنی مدافعت میں جو جوابی حملہ کیا یا معترضین کو جواب میں جو کچھ لکھا وہ دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا اور اس کی شہادت کہیں میسّر نہ ہو سکی۔

پہلی صورت میں اگر کسی خارجی یا اندرونی شہادت سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ فریق ثانی نے اپنے معترض کو کوئی جواب نہیں دیا، تو ہم اس کو ادبی معرکہ میں شمار نہیں کریں گے۔ لیکن دوسری صورت میں اگر اس قسم کی کوئی شہادت نہیں ملتی ہے تو ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ فریق ثانی واقعی خاموش ہو گیا ہو گا۔ کیوں کہ اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ فریق ثانی نے جواب میں جو کچھ لکھا ہے وہ ابھی پردۂ اخفا میں ہو۔ اس کی مثال عنایت اللہ حجام اور میر تقی میر کا معرکہ ہے۔ جس میں ہمیں میر کا ہجویہ کلام مل جاتا ہے مگر حجام کا کلام نہیں ملتا۔ اس لیے ہم ایسے واقعات کا، جن میں صرف ایک ہی فریق دوسرے کے مقابلے پر آیا ہو۔ اور فریق ثانی کی خاموشی کی شہادت نہیں ملتی ہو۔ ادبی معرکوں کے تحت مطالعہ کریں گے اور یہ اس لیے بھی درست ہے کہ فریق اوّل کو مشتعل کرنے میں اس کا یا اس کے گروہ کے کسی فرد کا ہاتھ ضرور رہا ہے: جس سے مجبور ہو کر

ؔ اس کی تفصیلات ہم آگے چل کر میر کے ادبی معرکے" میں حجام" عنوان کے تحت پیش کریں گے۔

وہ اس کے مقابلے پر آیا یا اس کی مذمت کی۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی شاعر نے اپنے آپ کو معاصر شعراء میں ممتاز کرنے کے لیے کسی ایسے مشہور شاعر پر حملے کئے جو اس کے دور سے پہلے گزرا ہے اور اس کے کلام پر نکتہ چینی کر کے اپنی برتری ظاہر کی ہے۔ ایسی صورت میں ہم اس کا مطالعہ ادبی معرکے کے تحت نہیں کریں گے۔ لیکن اگر اس شاعر کے (جو پہلے دور میں گزرا ہے اور اب زندہ نہیں ہے) شاگردوں نے فریق اوّل کا مقابلہ کیا یا اس کے اعتراض کا جواب دیا تو پھر ہم اس کو ادبی معرکہ کہیں گے۔ اس کی سب سے بہترین مثال مصحفی اور سودا کے شاگردوں کا معرکہ ہے۔ مصحفی نے عقد ثریا اور تذکرۂ ہندی میں جو سودا کی وفات کے بعد شائع ہوئے ہیں، سودا کے کلام پر اعتراضات کئے تھے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سودا کم علم ہیں۔ ان کی شہرت بازاریوں میں ہے۔ ہر جاہل اور امّی کی زبان پر ان کے اشعار ہیں۔ اور بعض لوگ کلام سودا میں اغلاطِ صریح اور توارد صاف کو سودا کے جہل اور سرقے سے نسبت دیتے ہیں۔ نثر کے علاوہ نظم میں بھی مصحفی نے سودا پر اعتراضات کئے مثلاً۔

یہ گو کہ یہ میداں یہ زباں اور یہ بیاں ہے
دعویٰ ہو جسے شعر کا آئے نہ کہاں ہے
سودا کے تئیں کہتے ہیں تھا شاعر مغلق
سو شاعری اس کی بھی بلمعنول پہ عیاں ہے
مضمون و معانی سے نہیں بہرہ کچھ اس کو
سچ پوچھو تو اردو کی فقط صاف زباں ہے

سو اس میں بھی تو غور سے دیکھے تو بہت جا
معنی مستتم لفظ سے فریاد کناں ہے

اس پر سودا کے شاگردوں نے مصحفی کو ان اعتراضات کا جواب دیا۔ اور یہ قصیدہ لکھ کر۔

کیا حضرت سودا نے کی ہے مصحفی تفہیم
کرتا ہے جو ہجو اس کی تو ہر صفحے میں تحریر

مصحفی کی ذات اور اس کے کلام پر وہ حملے کئے ہیں جن کو پڑھ کر کہنا پڑتا ہے کہ یہ بھی جائے عبرت ہے[1]۔

پروفیسر آل احمد سرور کی زبان میں کچھ "خاموش معرکے" بھی ظہور میں آئے ہیں۔ خاموش ادبی معرکوں سے مراد معاصر شعراء کا وہ کلام ہے جو یا تو شاعروں کے کسی مصرع طرح پر کہا گیا ہے یا پھر ایک دوسرے کے مقابلے میں کسی ایک عنوان یا مضمون پر لکھا گیا ہے۔ اس کی مثال ہم زمانۂ شاہ نصیر میں دہلی کالج کے اس مشاعرے کی غزلوں[2] سے پیش کر سکتے ہیں جس کے ردیف و قوافی "خس کی تیلیاں"۔ "قفس کی تیلیاں" تھے۔ دوسری مثال غالب و ذوق کے وہ سہرے[3] ہیں جو شہزادے جواں بخت کی شادی کے لیے لکھے گئے تھے۔ غالب نے اس کا مقطع اس طرح کہا تھا۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے۔ خلیق انجم، مرزا محمد رفیع علیگڈھ، ۱۹۶۶ ص ۳۲۹ تا ۳۳۶

[2] " " محمد حسین آزاد، آب حیات، شیخ مبارک علی تاجر لاہور، ص ۴۷۹

[3] " " ایضاً ص ۵۲۳ تا ۵۲۵

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

ذوقؔ نے بھی سہرا کہا اور مقطع کا بھرپور جواب دیا۔

جس کو دعوی ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا[1]

لالہ سری رام نے سوداؔ کا تذکرہ کرتے ہوئے "خم خانۂ جاوید" میں لکھا ہے "میر سوزؔ، میر دردؔ، میر تقیؔ سے معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں" یہ آل احمد سرور کہتے ہیں۔ "میرے نزدیک لالہ سری رام کی مراد معرکہ آرائیوں سے شاعروں کی وہ صحبتیں ہیں جن میں دردؔ میرؔ اور میر سوزؔ اپنا کلام سناتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی غزلوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے"۔[2]

ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "میرؔ نے نکات الشعراء میں لکھا ہے کہ اکثر دونوں کو اکثر ساتھ غزلیں کہنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ یعنی مشاعروں میں ایک ہی طرح میں غزلیں سناتے تھے۔ یہ گویا ایک طرح کا خاموش معرکہ تھا۔ یہاں زبان درازی، تو تو میں میں، بحث و تحقیق نہیں تھی نہ بات بات پر تلوار میان سے نکلتی تھی۔ مگر دونوں کا ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کا جذبہ اور دونوں کا نقطۂ ظاہر ہو جاتا تھا"۔[3]

اسی طرح انعام اللہ خاں یقینؔ کی طرز پر اسکے معاصرین نے غزلیں لکھنی شروع کیں تو اس نے کہا۔

حق کو یقین کے یارو برباد مت دو آخر ۔۔۔ تم نے سخن کی طرز یں اس سے اڑائیاں ہیں

---

[1] لالہ سری رام، خمخانۂ جاوید جلد ۳، ہمدرد پریس دہلی، ۱۹۲۶ء، ص ۲۶۳
[2] آل احمد سرور، میر و سودا۔ بحوالہ نورالحسن ہاشمی فروغ اردو، لکھنؤ، بمبئی نمبر فروری ۱۹۵۶ء، ص ۱۳
[3] ایضاً

ادبی معرکوں میں ہم ان ہجویات کو شامل نہیں کریں گے جو کسی غیر جاندار شے یا حیوانات کے بارے میں لکھی گئی ہیں، اخلاقی اور سماجی ہجووں کو بھی جن میں کسی عہد کی عام معاشرتی، تہذیبی، سیاسی، اور سماجی حالات کی خرابیوں کی مذمت کی گئی ہے اس عنوان کے تحت نہیں لائیں گے۔ غیر شاعر یا غیر ادیب کی ہجو کو بھی ادبی معرکہ نہیں کہیں گے۔ وہ روایتی طنزیہ ادب بھی ان معرکوں کی حدود سے باہر ہے جن میں کسی ایک گروہ یا طبقہ پر چوٹیں کی گئی ہیں۔ جیسے شیخ و برہمن یا واعظ و ناصح وغیرہ پر۔

ادبی معرکہ آرائیوں کے اسباب

زبان و ادب کی ترقی میں ایشیائی درباروں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ بادشاہوں کے دربار ہوں یا امراء کے، ہر زمانے میں ان سے مشہور اہل قلم، شاعر اور ادیب منسلک رہے ہیں۔ خاص طور سے شاعروں کی ان درباروں میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ جہاں ان درباروں سے انکو وظائف اور تنخواہیں ملتی تھیں، وہاں طرح طرح کے اعزاز، خلعتوں اور انعامات سے بھی نوازا جاتا تھا۔ ان کی نازبرداری کی جاتی تھی اور حوصلہ افزائی بھی۔ نتیجے کے طور پر ہر اچھے شاعر کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کی کسی دربار میں رسائی ہو جائے اور ہر درباری شاعر یہ کوشش کرتا تھا کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں صاحب دربار سے زیادہ قریب ہو جائے۔ اسی جذبے نے درباری شاعروں کو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رکھا۔ دوسرے ایشیائی درباروں میں خوشامد بھی ترقی کا ایک ذریعہ تھی، جو ذاتی صلاحیتوں کے اظہار سے کہیں زیادہ، دوسروں کی تذلیل اور عیب جوئی میں ظاہر ہوتی تھی اور اکثر معاملات کو نزاعی شکلوں میں تبدیل کر دیتی تھی۔ اس لیے ان درباروں میں عام رقابت، حسد اور بغض و عناد کے کمتر جذبات خوب پرورش پاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے درباری شاعروں نے بھی ایک دوسرے کے خلاف اگلا ہے۔ ایک دوسرے کو مطعون کیا ہے۔ کچھ نے دوسروں کو نیچا دکھایا،

بعض نے خود نیچا دیکھا۔

فارسی ادب کا بیشتر حصہ انہی درباروں میں تخلیق ہوا ہے۔ اور یہ درباری فضا جس قسم کے ادب کی متقاضی تھی وہ ہجو اور قصائد کا ادب تھا۔ جو اس درباری ماحول میں خوب پنپا۔ فارسی شعراء نے تو ان دونوں اصنافِ سخن کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ ان درباروں میں جہاں ایک طرف شعراء کی قدر و منزلت تھی وہاں درباری رقابتوں کی وجہ سے اکثر شعراء کو تلخ زندگی بھی بسر کرنا پڑتی تھی اور بعض حالتوں میں شاعر بہت زیادہ ذلیل ہو جاتا تھا۔ اسی بنا پر انوری نے اپنی ایک نظم میں شاعری کو خاکروبی کے پیشے سے بھی زیادہ حقیر اور کمتر قرار دیا ہے۔ اس نظم کے ابتدائی شعر یہ ہیں۔

ای کہ مردک کناس نہی گفتم دوش	تو چہ دانی کہ ز غبن تو دلم چوں خستہ است
صنعت و پیشۂ ماہر دو بھی دانی چیست	آں پراتیز رود و ایں نہ چہ رو آہستہ است
گفت از عیب خود از ہنر ما مشناس	زیں کہ بار از چنار آتش واز نے خستہ است
کارفرمائے رود بدر و نق کار من و تو	داند آں کس کہ دمے با من و تو بنشستہ است

فارسی کی طرح اردو بھی شاہی درباروں میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ بادشاہوں کے دربار سے لے کر امراء اور نوابین کے درباروں تک شعر و شاعری طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ لہٰذا اردو ادب میں بھی درباری شعراء کی معرکہ آرائیوں کی روایت بدستور قائم رہی۔ بلکہ بعض اوقات تو صاحب

ے "فارسی شاعری تو تقریباً تمام تر درباری رہی ہے" تفصیل دیکھئے۔ رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، الہ آباد، ص ۴۳

دربار نے بھی ان میں حصہ لیا۔ وہ خود فریقین کو شہہ دے کر لڑواتے تھے۔ اور مزا لیتے تھے۔ اسی سلسلے میں آبِ حیات کا ایک واقعہ قابلِ غور ہے۔

"ایک شعر پر سید انشا اور شیخ مصحفی میں شکر رنجی ہو گئی۔ اور طبیعتوں کی شوخی نے زبانوں کی بے باکی کے ساتھ مل کر بڑے بڑے معرکے کیے۔ اس وقت آصف الدولہ شکار میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لکھنؤ میں نہ ہونے پر ہزار افسوس کئے اور بڑے اشتیاق سے ان ہجوؤں کو منگا کر سنا اور انعام بھیجے۔"[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان معاملات میں کتنی دل چسپی لیتے تھے اور بعض دفعہ اپنی درباری عظمت کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ محمد حسین آزاد کا ایک اور بیان بھی اس امر کی تائید کرتا ہے۔

"ایک دن جب حسبِ معمول مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں پائیں باغ میں تخت بچھے تھے۔ صاحبِ عالم خود مسند پر بیٹھے تھے۔ شرفا و شعرا کا مجمع تھا۔ مرزا رفیع اور میاں سکندر مرثیہ گو بھی موجود تھے کہ میر ضاحک تشریف لائے۔ اتفاقاً صاحبِ عالم نے مرزا رفیع سودا سے کہا کہ کچھ ارشاد فرمائیے۔ سودا نے کہا میں نے تو ان دنوں میں کچھ کہا نہیں۔ میاں سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انھوں نے ایک مخمس کہا تھا۔ صاحبِ عالم نے فرمایا کیا؟ سودا نے پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ میر ضاحک مرحوم اٹھ کر میاں سکندر سے دست و گریبان ہو گئے۔"

---

[1] محمد حسین آزاد، آبِ حیات، شیخ مبارک علی تاجر لاہور ص ۲۸۵

سکندر بچارے حیران کہ نہ واسطہ نہ سبب یہ کیا آفت آگئی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے دونوں صاحبوں کو الگ کیا اور سودا کو دیکھئے تو کنارے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ [۱]

اس مخمس کا پہلا بند ہے۔

یا رب تو میری سن لے یہ کہتا ہے سکندر
ضاحک .... کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہو اگر بچہ بندر
گلیوں میں نچاتا پھرے وہ بنگلے کے اندر
روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے موقعوں پر صاحب دربار چپکے تماشہ دیکھتے تھے۔ نہ شاعر دربار کا خیال کرتے تھے اور نہ خود صاحب دربار کو اپنی شان کا خیال رہتا تھا۔ بس شاعروں کی ہاتھا پائی سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ انشا اور مصحفی کے معرکہ میں بھی شہزادہ سلیمان شکوہ نے ایک فریق کی پشت پناہی کی تھی۔ [۲]

دربار کے علاوہ عام ادبی محفلیں اور مشاعرے بھی شاعرانہ معرکہ آرائیوں کے اکھاڑے بن گئے تھے۔ ان شاعروں کی طرز ادا ان کے آداب میں کچھ ایسی نزاکتیں تھیں جن سے کسی بھی شاعر کو تلخی اور ناگواری

---

[۱] محمد حسین آزاد، آب حیات، شیخ مبارک علی تاجر، لاہور ص ۱۸۳

[۲] "ان معرکوں میں مرزا سلیمان شکوہ۔ بلکہ اکثر امرا نے سید انشاء کا ساتھ دیا اور حریف کے سوانگ کو کوتوال سے کہہ کر ایک دفعہ رکوا دیا" آب حیات، ص ۳۲۵

ہو سکتی تھی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ مشاعرے کے لیے ایک مصرعِ طرح رکھ دیا جاتا تھا اور ہر شاعر کو اس طرح میں اپنی غزل کہہ کر لانی پڑتی تھی۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مشاعرہ شعر خوانی کے ساتھ مقابلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ طرفہ تماشہ یہ کہ جس شاعر کی غزل اس مشاعرے میں کامیاب رہتی اس کو کہا جاتا کہ اس نے مشاعرہ جیت لیا۔ یہی جیت رشک و رقابت کی آگ بھڑکاتی تھی۔ جس کے نتیجے میں مقابلہ بازی ہوتی اور پھر معرکہ آرائی تک نوبت پہنچ جاتی۔ دوسرے تقدیم و تاخیر کے آداب نے بھی آپس میں شکر رنجیاں پیدا کی ہیں۔ بعض شعرا محض اس بنا پر غزل سنانے سے انکار کر دیتے تھے یا مشاعرہ گاہ سے اٹھ کر چلے جاتے تھے کہ ان کو ان شاعروں سے پہلے پڑھنے کے لیے کیوں کہا گیا جن کو وہ اپنے سے بہتر نہیں سمجھتے۔ یہی وہ نزاکت تھی جو معاصرین شعرا میں اکثر نفاق کا باعث بن جاتی تھی۔

اس کے علاوہ مشاعرے کی غزلوں کے بعض اشعار اپنے رمز و کنایہ کی وجہ سے عجیب بدگمانیاں پیدا کر دیتے تھے بمقطعوں کی شاعرانہ تعلی بھی بعض حالتوں میں دعوتِ جنگ خیال کر لی جاتی تھی۔ کسی شاعر کا کسی کی غزل پر داد نہ دینا بھی اس کی طرف سے بدظن کرتا تھا۔ برسرِ مشاعرہ کسی کے شعر پر اعتراض یا استہزا کرنا بھی دشمنی کے بیج بو دیتا تھا۔ مشاعروں کی انھی خامیوں یا خصوصیات کے سبب بہت سے شاعر آپس میں ایک دوسرے کے مقابلے پر آجاتے تھے اور ایک دوسرے کو ایذا پہنچانے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے اس کی بہترین مثال[۱]

---

[۱] تفصیلات کے لئے دیکھئے "آبِ حیات"، شاہ نصیر و ذوق ص ۴۸۰، ۴۷۹، معرکۂ عظیم و دانشا ص ۲۶۱ تا ۲۶۶

انشا اور عظیم کا معرکہ اور شاہ نصیر و ذوق کی چشمکیں ہیں۔

شاعری کے فن میں استادی اور شاگردی کو بہت بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جہاں کسی شاعر کے لیے یہ فخر کی بات تھی کہ وہ اپنے زمانے کے مسلم الثبوت استاد سے تلمذ رکھتا ہے وہاں استاد بھی اس بات پر ناز کرتا تھا کہ اس کے شاگرد ہونہار اور ذہین ہیں۔ دوسرے لوگ بھی اس بات کا خیال رکھتے تھے۔ بغیر استاد کے کسی شاعر کو بہت کم امتیاز حاصل ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ غالب کو بھی مجبور ہو کر ایک فرضی استاد کا سہارا لینا پڑا۔ اقبال شاگردی داغ پر فخر کرتے تھے تو مصحفی اپنے شاگردوں پر نازاں تھے۔

نہیں یہ ہجو کے قابل پر انکی خدمت کو
جو یوں ہی چاہیں تو کافی ہیں بس مرے خدام
اگرچہ ہیں وہ جواں ولیکن ان میں سے
بلا ہیں منتظر و گرم، جوں برہنہ حسام

حاتم کو بھی سودا کی شاگردی پر ناز تھا۔ جب سودا کی غزل پر اصلاح دیتے تھے تو اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

از ادب صاحب خموشم ورنہ در ہر دادیئے
رتبہ شاگردی من نیست استاد مرا

استادی و شاگردی کے اس فخر و افتخار نے بہت سی ہنگامہ آرائیوں کو فروغ دیا۔ جہاں ایک شاعر کی دوسرے سے ان بن ہوئی وہیں شاگردوں نے اپنے ہاتھوں میں کمانیں تھام لیں۔ طرفین سے آوازے کسے جانے لگے۔ ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھالی جانے لگیں اور طرح طرح کے فتنہ و فساد برپا ہونے لگے۔ انشا اور مصحفی کے معرکوں میں ان کے شاگردوں نے بڑی تباہی

مچائی تھی۔ سوداؔ کے شاگرد[1] بھی مصحفیؔ کے مقابلے پر آ گئے تھے۔ اور میرؔ کو بھی سوداؔ کے بہت سے شاگردوں سے تکلیف پہنچی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ شاگرد اور استاد میں بگڑ گئی اور شاگرد نے دوسرے شاعر سے تلمذ اختیار کر لیا۔ ایسی صورت میں وہ بعد کو اپنے پہلے استاد کے مقابلے پر بھی آیا۔ قائمؔ چاندپوری پہلے ہدایت اللہ کے شاگرد تھے پھر انھوں نے دردؔ کی شاگردی اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے پہلے استاد کی ہجو میں اشعار کہے[2]

حضرتِ دردؔ کی خدمت میں جب آ قائمؔ نے
عرض کی یہ کہ اِلٰہ استادِ زماں سنتے ہو
امرہووے تو ہدایت کو کروں میں سیدھا
واں سے ارشاد ہوا یہ کہ میاں سنتے ہو
راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کج طینت
تیر بنتی ہے کہیں شاخِ کماں سنتے ہو

علاقائی تعصب نے اکثر معرکہ آرائیوں کا سبب بن جاتا ہے۔ اردو شاعری میں لکھنؤ اور دہلی کے اسکول میں ہمیشہ جھگڑا رہا ہے۔ رجب علی بیگ سرورؔ نے فسانۂ عجائب[3] میر امن دہلوی کی باغ و بہار کے جواب میں لکھی تھی۔ اور اسکی سادہ اور سلیس زبان کا مذاق اڑایا تھا۔ پھر فسانۂ عجائب کے جواب میں بھی بعد کو دہلی میں کتابیں لکھی گئیں۔ ایرانی شاعر فارسی گو ہندوستانی شعراء کو اسی

---

[1] تفصیل دیکھیے خلیق انجم، مرزا رفیع سودا، علیگڈھ ۱۹۶۶، ص ۳۲۹ تا ۳۴۶

[2] قائمؔ حکیم قدرت اللہ، مجموعۂ نغز حصہ دوم مرتبہ محمود شیرانی، لاہور ۱۹۳۳ء، ص

[3] دیکھیے دیباچہ فسانۂ عجائب

جلا قائی تعصب کی بنا پر خاطر میں نہیں لائے۔ سراج الدین خاں آرزو اور شیخ علی حزیں کا معرکہ اسی وجہ سے ظہور میں آیا۔ خان آرزو کا رسالہ تنبیہ الغافلین اسی معرکہ کی یادگار ہے۔

کسی شاعر کی بد مزاجی یا فطری اخلاقی کمزوری بھی اس کی طرف سے کدورت پیدا کرتی تھی۔ میر تقی میر کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے سے بڑے شاعر کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کسی کے کلام[1] پر داد دینا تو درکنار، کسی کے اچھے شعر پر سر ہلانا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ جب جرأت نے اپنے مشاعرے کی ایک کامیاب غزل پر میر سے داد چاہی تو انھوں نے کہا "کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہنا نہیں جانتے۔ اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو۔"

اپنے معاصرین پر چھا جانے کی خواہش یا اپنی برتری کا اظہار بھی دوسروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ[2] میر نے اپنے معاصرین سے مشتعل ہو کر یا اپنے زعم شاعری میں مشاعرے کے اندر اپنی مثنوی اژدر نامہ پڑھی اس میں انھوں نے اپنے آپ کو بڑا اژدہا ثابت کیا اور معاصرین کو گرگٹ، لومڑی، گیدڑ اور کیڑے مکوڑے بتایا۔ اس پر محمد امان نثار بہت چراغ پا ہوئے اور انھوں نے بھرے مشاعرے میں اپنی غزل کے مقطع میں ان پر وار کیا۔ جس کی بڑی واہ واہ ہوئی۔ اسی طرح نسلی برتری کا اظہار اور قومی افتخار بھی لوگوں کو اچھا نہیں لگتا خصوصاً ہم عصر شاعروں کو۔ میر نے جگہ جگہ اپنی سیادت کا بڑے فخر کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ لوگوں نے اس پر بھی چھینٹے اڑائے۔ چنانچہ

---

[1] تفصیل دیکھیے آب حیات : ص ۲۰۱

[2] ایضاً ص ۲۰۷

سودا اور قائم نے میر کی سیادت سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ ان کو کم قوم (نان بائی) کی اولاد بھی بتایا۔ قائم کا شعر ہے۔

روٹی کے لیے کہاتے تم میر جی میر
کہئے تو بجا ہے آپ کو میر خمیر

جہاں کسی شاعر کی بد دماغی اور رعونت دوسروں کو بدگمانی اور دشمن بناتی ہے وہاں اس کی ٹھٹھول اور ہنسی مذاق کی عادت بھی، اگر بے اعتدالی کی حد تک پہنچ جائے، تو کھٹکنے لگتی ہے۔ جعفر زٹلی، انشا اور سودا خاص طور سے اپنی اسی افتادِ طبع کی وجہ سے بہت سے جھگڑوں میں پھنسے ہیں۔

کسی شاعر یا ادیب کی ہیئت کذائی اور اس کی شخصیت کا کوئی مضحکہ خیز پہلو بھی لڑائی جھگڑے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس ضمن میں خاکسار اور دانا کی مثالیں موجود ہیں۔ خاکسار اور سودا کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ ایک مجلس میں خاکسار نے میر کی ہجو میں کچھ کہا اور حاضرین مجلس سے بھی درخواست کی کہ ان کی ہجو میں کچھ کہیں۔ بات کچھ بے موقع تھی اس لیے کسی کو پسند نہیں آئی۔ البتہ سودا نے ان کا دل رکھنے کے لیے ایک مطلع موزوں کر کے انھیں دے دیا۔ وہ یہ ہے۔

میر کا مکھڑا ہے بے انتہا گل زنبق سا ہے
پیٹ بھی اس کا جو میں دیکھا سو کچھ مھبتی سا ہے

کیوں کہ خاکسار کا پیٹ معمول سے کچھ زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ انھیں یہ طنز بہت ناگوار گذرا اور اسی دن سے ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ ایک محفل میں

لہ تفصیل دیکھیے۔ قائم، مخزن نکات، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ص ۵۲

سودا نے فضل علی دانا کی ہیئت کذائی دیکھ کر یہ مصرع پڑھا تھا۔

"یارو یہ ہولی کا بھڑوا آیا"

ایسی ٹھٹھول اور دل لگی سے بھی آپس میں شکر رنجیاں پیدا ہو گئیں ہیں اور ان کا انجام بہت خراب ہوا ہے۔

کسی تیسرے فریق کے ذریعے بھی دو فریقوں کی بد گمانیاں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ یہ تیسرا فریق دونوں پارٹیوں کو ابھارتا ہے۔ اور اکثر انھیں کی وجہ سے میدان جنگ گرم ہو جاتا ہے۔ ان میں شاگردوں کا گروہ اور دوسرے غیر سنجیدہ یا مزا لینے والے حضرات بہت زیادہ پارٹ ادا کرتے ہیں۔ ان کی مثالیں تقریباً ہر بڑے چھوٹے معرکے میں نظر آجاتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ سیاسی اور ذاتی مفاد کی بنا پر ایک شاعر کو دو فریقوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دینا پڑا، اس کی مثال ہمیں خان آرزو اور مرزا مظہر گروہ سے مل جاتی ہے۔ میر نے خان آرزو گروہ کا ساتھ دیا اور محض اسی لیے انھیں مرزا مظہر کے کئی شاعروں کے مقابلے پر آنا پڑا، اور انھیں نیچا دکھانے کی کوشش کی۔

مندرجہ بالا بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادبی معرکوں کے ظہور میں آنے کے مختلف وجوہات تھے۔ ان میں ذاتی اختلافات، خاندانی رنجشیں، معاصرین پر چھا جانے کی خواہش، درباری رقابتیں، اخلاقی گراوٹ وغیرہ بہت سی باتیں ایسی آجاتی ہیں جن کا تجزیہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اور بعض معاملات میں بہت سے ایسے عناصر بھی کارفرما ہوتے ہیں جو بظاہر نظری اور غیر اہم معلوم ہوتے

لہ میر نکات الشعرا، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو، ص ۱۲۸

لہ اس کی تفصیلات ہم نے میر کے ادبی معرکے میں 'یقین' عنوان کے تحت پیش کی ہیں۔

ہیں لیکن ان کا تعلق فریقین کے ذہن و شعور اور ان کی نفسیات سے بہت گہرا ہے

اردو میں ادبی معرکوں کی روایت

اردو نے شاہی اور جاگیردارانہ نظام میں پرورش پائی تھی۔ یہ وہ دور تھا جس میں ذرائع آمدنی محدود تھے۔ ہر فرد کی گزر اوقات زیادہ تر اس کے آبائی پیشہ پر منحصر تھی۔ انھی پیشوں کی نسبت سے مختلف فرقے اور ذاتیں وجود میں آئیں۔ چونکہ ہر فرقے کا اپنا ایک مستقل پیشہ تھا جو اپنی معمولی بساط اور محدود وسائل کی بنا پر بہت ہی مختصر حلقوں میں سمٹا ہوا ہوتا تھا۔ اسی لیے ہر طبقہ میں پیشہ ورانہ چشمک اور رقابت موجود تھی۔ یہ حال مجموعی طور پر تمام سوسائٹی کا تھا۔ یہاں کی تمام تر تمدنی، معاشرتی اور سماجی اقدار اسی فضا میں پروان چڑھیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ معمولی پیشوں سے لے کر علم و فن کی بلند سطح تک ہر کہیں رقابت کی یہ ذہنیت کارفرما تھی۔ شعبدہ بازی کے تمام مقابلوں سے لے کر مذہبی مناظرے اور علمی مباحثے بھی ذاتی اور خاندانی رنجشوں کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ شعر و ادب میں بھی یہی حال تھا۔ مگر اردو میں یہ معرکہ آرائیاں تنہا یہیں کی تہذیب و معاشرت کا نتیجہ نہ تھیں بلکہ یہ روایت ہمیں عربی اور فارسی کے ادب سے بھی ملی ہے۔

عربی ادب میں ہجو نگاری کو بہت فروغ حاصل ہوا تھا۔ ایک قبیلہ کا شاعر دوسرے قبیلے کی ہجو کرتا تھا اور دوسرے قبیلے کا شاعر بھی اس کا بھرپور جواب دیتا تھا اس طرح معرکہ آرائی کا باقاعدہ آغاز ہو جاتا۔ مسیح الزماں نے بھی اپنی کتاب "اردو تنقید کی تاریخ" میں اسی صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"چونکہ عرب کے تپتے ہوئے ریگستان میں نخلستان کے گرد مختلف قبیلے آباد تھے جن میں اکثر چشمک رہا کرتی تھی۔ مسافروں کی مہمان نوازی، غریبوں کی امداد، حسن کی دل نوازی، ساتھیوں کی حمایت، حفاظت ان کی خاص دل چسپیاں تھیں۔ اس لیے ان کی شاعری بھی انھی راستوں پر چلی۔ ہر شاعر اپنے قبیلے کی مدح میں یہی اوصاف بیان کرتا اور کسی قبیلے کی ہجو میں انھیں کی کمی ثابت کرتا۔" [1]

پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ

"شاعر قبیلے میں خاص عزت و رفعت کا مالک ہوتا تھا۔ قبیلے والے اس کی تمنا کیا کرتے کہ ان کے یہاں بھی کوئی ایسا شاعر پیدا ہو جو ان کے کارنامے بیان کرے اور مخالفین کو ذلیل ٹھہرائے۔" [2]

اس چشمک کا یہ نتیجہ ہوتا کہ آپس میں خوب ہجویں ہوتیں اور خوب جھگڑے ہوتے۔ "تاریخ ادبیات ایران" میں اس کے مصنف نے سنائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"فرزدق اور جریر پہلی صدی ہجری کے دو عرب مشہور شاعر گزرے ہیں۔ یہ دونوں شاعر آپس میں مناظرے کرتے رہتے تھے۔ جریر نے فرزدق کی ہجو لکھی ہیں۔" [3]

فارسی میں بھی یہ معرکہ آرائیاں ہیں اس کے ابتدائی دور سے ہی مل جاتی ہیں۔ ان معرکہ آرائیوں میں کبھی ایک فرد دوسرے کے مقابلے پر آتا تھا اور کبھی ایک دوسرے کے طرفدار بھی آپس میں کیچڑ اچھالتے تھے۔ "تاریخ ادبیات ایران" سے ہم ایک واقعہ نقل کرتے ہیں

---

[1] مسیح الزماں، "اردو تنقید کی تاریخ"، الہ آباد، ۱۹۵۴ء، ص ۹

[2] ایضاً ص ۹

[3] ڈاکٹر رضا زادہ شفق، "تاریخ ادبیات ایران"، مترجمہ مبارز الدین رفعت، حیدرآباد، ۱۹۶۴ء، ص ۱

"مجیرالدین خاقانی کا شاگرد تھا لیکن بعد میں کچھ ایسے افسوسناک واقعات پیش آئے کہ وہ استاد کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ اور بالکل اسی طرح جیسے خاقانی نے اپنے استاد ابوالعلا گنجوی کی ہجو کی تھی۔ مجیر نے بھی خاقانی کی ہجو کی۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ مجیر اصفہان کا صوبیدار مقرر ہو کر وہاں آیا تھا لیکن چونکہ خود وہ اس عہدہ کا اہل نہ تھا اس لئے اصفہان والوں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ اس بات سے اسے بڑا رنج ہوا اور اس نے ہزل میں اصفہانیوں کی ہجو لکھی۔

اس میں یہ رباعی بھی ہے۔

گفتم ز صفاہاں مدد جاں خیزد   لعلی است مروت کہ ز کاں خیزد

کی دانستم کاہل صفاہاں کورند   باایں ہمہ سرمہ کز صفاہاں خیزد

ایسے ہی کچھ اور شعر ملاحظہ ہوں۔

صفاہاں خرم و خوش می نماید   بساں پر شہر آرائی طاؤس

دلی زیں باغ طبعاں کاہل شہر اند   خجل شد بال خوش سیمائی طاؤس

یقیں می داں کہ سیمرغ صفاہاں   چو طاؤس است و ایناں پائی طاؤس

ان اشعار کی وجہ سے اصفہان کے لوگ اور بھی برہم ہوئے اور یہاں کے شاعروں نے بھی جواب میں اس کی خوب ہجو کی

اسی سلسلے میں جمال الدین عبدالرزاق نے اس تصور میں کہ مجیر نے یہ ہجو خاقانی کے اشارے پر لکھی ہے مجیر اور خاقانی دونوں کی ہجو لکھ ڈالی۔ خاقانی کے کانوں تک یہ ہجو پہنچی تو اس نے رفع اشتباہ کے لیے اصفہان کی مدح میں اپنا وہ قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے۔

نکہت حوراست با صفائی صفاہاں   جبہت جوزاست یا لقائی صفاہاں

اس قصیدے میں مجیر کو الٹ کر رجیم بنایا ہے اور اس کی اس طرح ہجو کی ہے۔

دیو رجیم آنکه بود دزد بیانم ۔۔ گردم طغیان زد از هجائی صفاهان

او ربقیامت سپید او ی نخیزد ۔۔ زانکه سینه ببست بر قفای صفاهان"

"جمال الدین اصفہانی اپنے زمانے کے شعراء سے شعر بازی کیا کرتا تھا۔ ان میں مجیر بیلقانی اور خاقانی وغیرہ شامل تھے۔ اس نے اپنے ایک قصیدے کی ابتدا میں جو خاقانی کو خطاب کر کے لکھا گیا ہے، اس کی مذمت کی ہے۔ قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

کیست که پیغام من بشهر شروان برد

یک سخن از من بدان مرد سخندان برد "۲۵

"نقوش" کے طنز و مزاح نمبر میں پروفیسر علیم الدین سالک اپنے ایک مضمون "فارسی ادب میں طنز و مزاح" میں خاقانی کے متعلق لکھتے ہیں۔

" خاقانی فارسی زبان و ادب کا سب سے بڑا قصیدہ نگار ہے۔ وہ حسان العجم کہلاتا ہے۔ ہر شاعر اس کا نام ادب و احترام سے لیتا ہے۔ وہ شاعری میں ابو العلا گنجوی کا شاگرد ہے۔ جس نے اس کی قابلیت سے متاثر ہو کر اپنی لڑکی کی شادی بھی اس سے کر دی تھی۔ بعد میں جب حالات نے پلٹا کھایا اور استاد شاگرد میں چل پڑی۔ یہ معاملہ اس حد تک بڑھ گیا کہ دونوں نے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا شروع کیا۔ تحفۃ العراقین میں خاقانی نے اپنے حج کے حالات لکھے ہیں۔ لیکن وہاں بھی وہ اپنے استاد پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آتا۔ چنانچہ کہتا ہے

یعنی سگ گنجه زادرین کوی ۔۔ هم زه تفادهم سیاه روی

رشید الدین وطواط خاقانی کا ہم عصر اور دوست تھا۔ دونوں میں بڑی محبت تھی خاقانی نے اس کی مدح میں ایک زبردست قصیدہ لکھا۔ جس میں اس نے لکھا۔

---

۲۵ ڈاکٹر رضا زادہ شفق، تاریخ ادبیات ایران، مترجمہ سید مبارز الدین رفعت، حیدر آباد ۱۹۶۴ء، ص ص ۲۷۸، ۲۷۹، ص ۲۴۳

اگر بکوہ رسیدے روایت سخنم
زبہے رسید جواب آمدے بجائے صدا

لیکن آخر میں اس سے بھی ان بن ہو گئی اور خاقانی نے اس کی بھی ہجو لکھی۔"

عبید زاکانی اور سلمان ساوجی کا بھی ایک بہت دل چسپ معرکہ ہوا ہے
عبید زاکانی فارسی ادب کا ایک زبردست ہجو گو شاعر تھا۔ اس کے دوستوں نے اس کو اس غیر مستحسن فعل سے باز رکھنے کی کافی کوشش کی مگر اس کے پاس اس کا یہی جواب تھا

مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز
تا داد خود از مہتر و کہتر بستانی

سلمان ساوجی نے عبید زاکانی کی اس روش سے ناخوش ہو کر ایک قطعہ میں اس کی مذمت کی

جہنمی ہجا گو عبید زاکانی — مقرر است بہ بیدولتی و بے دینی
اگرچہ نیست ز قزوین روستا زادہ است — ولیک میشود اندر حدیث قزوینی

عبید یہ قطعہ سن کر بہت برہم ہوا۔ اور سلمان کی تلاش میں بغداد پہنچا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ سلمان اس وقت دجلہ کے کنارے اپنے کچھ مصاحبوں کے ساتھ سیر و تفریح میں مشغول ہیں۔ یہ بھی وہیں پہنچے۔ اس وقت دجلہ پر سیلابی کیفیت طاری تھی۔ سلمان نے یہ مصرعہ پڑھا۔

دجلہ را امسال رفتار عجب مستانہ است

عبید نے برجستہ جواب دیا۔

۱؎ محمد طفیل، نقوش، طنز و مزاح نمبر ۷۱، ۷۲ لاہور، فروری ۱۹۵۹، ص ۱۲۷

پائے در زنجیر دکف بر لب مگر دیوانہ است

سلمان بہت خوش ہوئے کہنے لگے کہاں سے آنا ہوا۔ عبید نے کہا قزوین سے۔ سلمان نے کہا سلمان کا کلام تو وہاں کے لوگوں میں کافی مقبول ہے۔ اگر کچھ یاد ہو تو سناؤ۔ عبید نے یہ قطعہ پڑھا۔

من خراباتیم و بادہ پرست
در خرابات مغاں عاشق و مست
میکشندم چو سبو دوش بدوش
می برندم چو قدح دست بدست

اور پھر بولے کہ سلمان بڑے رتبہ کا شاعر ہے۔ یہ کلام اس کا نہیں ہو سکتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر اس کی بیوی نے کہے ہوں گے اس بات پر سلمان بہت بگڑے۔ عبید نے اپنا نام بتایا اور کہا کہ تم بے دیکھے لوگوں کی ہجویں کہتے ہو یہ اچھا نہیں ہے۔ میں تمہیں ہجو گوئی کا مزہ چکھانے آیا تھا۔ مگر یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اب میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اس پر سلمان بہت خوش ہوئے اور ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ [1]

بعد کے جن شعراء میں آپس میں معرکہ آرائیاں ہوئیں ان میں ملا ظہوری، عرفی، نظیری، ملک قمی، اور فیضی تھے۔ عرفی نے نظیری کو قابل اعتنا نہ سمجھا۔ مگر نظیری نے عرفی کے مرنے کے بعد اس کو برا بھلا کہا۔ اور اپنے قصائد میں اپنے دل کا بخار نکالا۔

---

[1] یہ واقعہ مولانا شبلی اور رشید احمد صدیقی نے بھی بیان کیا ہے۔
رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، ص ۳۶
شبلی: شعر العجم حصہ دوم اعظم گڑھ، ص ص ۲۰۱، ۲۰۲

آخیر میں ہم اس عہد کا ایک واقعہ نقل کریں گے۔ مولانا شبلی نے شعر العجم' میں لکھا ہے۔

"نشانی ایک مہر کن ملا صاحب (یعنی ملا عبد القادر بدایونی) کے ساختہ پرداختہ تھے۔ وہ فیضی کے عروج کو دیکھ کر سخت جلتے تھے۔ اور اس کی شان میں ہجو آمیز اشعار کہا کرتے تھے۔ فیضی نے ایک قصیدہ لکھا تھا۔

شکر خدا کہ عشق بتاں ست رہبرم
برملت برہمن و بر دین آذرم

اگرچہ فیضی نے اس شعر کے بعد بت اور برہمن کے معنی بتا دیئے تھے کہ متداول معنی مراد نہیں۔

بت چیست ؟ پرتو نگاشتہ معنی جبیں — کاندر کلیسائے ضمیرست مضمرم
استاد برہمن کہ زبت خانہ خیال — در سجدۂ حضور فرود آورد سرم

لیکن نشانی صاحب اس لطف کو کیا سمجھ سکتے تھے۔ انھوں نے اس کی چوٹ پر فوراً ایک قصیدہ لکھ ڈالا۔

شکر خدا کہ پیرو دین پیمبرم — حب رسول و آل رسول ست رہبرم
قائل بہ روز حشر و قیام قیامتم — امیدوار جنت و حوری و کوثرم

لیکن یہاں تک بھی غنیمت ہے۔ لیکن ایک مثنوی میں فیضی کے کلام شاعری کا بھی انکار کرتے ہیں۔

دعوے ایجاد معانی مکن — شیخ شہ چرب زبانی مکن
طبع تو ہر چند در ہوش او — یک سخن تازہ نشد گوش زد
انچہ تو گفتی دگراں گفتہ اند — در کہ تو سفتی دگراں سفتہ اند
خانہ کہ از نظم بیاراستی — آب د گلش از دگراں خواستی

تازگی آں نہ ز باراں تست — از نوے پیشانی یاراں تست
چند پئے نقد کساں سوختن — چشم بہ مال دگراں دوختن
شربت بیگانہ فراموش کن — آب ز سرچشمۂ خود نوش کن
گر خضری آب حیات تو کو؟ — ور شکری شاخ نبات تو کو؟

ملا صاحب نے ان اشعار کو (انشائی کے حال میں) نہایت جوش سے نقل کیا ہے، بھی فیضی کے حال میں فرماتے ہیں کہ چالیس برس تک استخواں بندی کرتا رہا۔ لیکن ایک شعر مزے کا نہ نکلا" [۱]

ان واقعات سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ فارسی ادب کی تاریخ کے تقریباً ہر دور میں معاصر شعراء میں یہ باہمی کشمکش ملتی ہے۔ انھوں نے زندگی میں بھی ایک دوسرے کے خلاف زہر اگلا اور مرنے کے بعد بھی اپنے دشمنوں کو نہیں بخشا۔ ان معرکوں میں باہمی لعن طعن بھی ہوئی۔ پھکڑ بازی کا مظاہرہ بھی ہوا اور ایک دوسرے کے درپے آزار بھی ہوئے۔

اردو ادب میں بھی ان معرکہ آرائیوں کی یہی نوعیت رہی۔ دکنی شعراء میں یہ روایت موجود تھی۔ مگر یہ چنگاریاں ایسی نہ تھیں جن سے آگ بھڑک اٹھتی۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" میں شیوک کے بیان میں لکھا ہے۔

"اس کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ یہ شیعہ مذہب کا پیرو تھا اور اسی دور کے ایک دوسرے شاعر لطیف سے اس کی چشمک تھی۔" [۲]

لطیف کے متعلق لکھا ہے۔

۱۔ شبلی، شعر العجم حصہ سوم، لاہور، ۱۹۲۴ء، ص ۵۳

۲۔ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۹

"سلطان عبداللہ کے عہد میں ہوا ہے اور امرائے قزلباش سے تعلق رکھتا تھا۔ شاعری تفنن کی خاطر کیا کرتا تھا۔ اپنی امارت اور شرافت کے ساتھ اپنے حیدرآبادی ہونے پر اظہارِ فخر کرتا ہے۔"[1]

مصنف نے اس چشمک کی کوئی تفصیل نہیں بتائی اور نہ اس ضمن میں کوئی شعر ہی درج کیا۔ مگر اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ دکنی ادب کے ابتدائی دور میں بھی یہ شرارے موجود تھے۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے 'شعرالہند' میں ولی کے عہد کے متعلق لکھا ہے "ولی کے ترقی یافتہ دور میں متعدد مشہور شعرا شامل تھے۔ مثلاً فراقی، احمد گجراتی، آزاد، سراج، ضیائی، ملک، فخری، حشمت، عزیز، عبدالرحیم، عبداللہ، حلیب اور حسن وغیرہ[2]" پھر لکھتے ہیں۔ تاہم اس قدر یقینی ہے کہ اس دور میں شعرا کا ایک مستقل گروہ پیدا ہو گیا تھا، جن میں باہم نوک جھونک اور رشک و منافست جو شاعری کی گرم بازاری کی ایک علامت ہے، رہا کرتی تھی چنانچہ ولی کہتے ہیں۔

ترے اشعار ایسے نیں فراقی
کہ جس پر رشک آوے گا ولی کو۔"[3]

دوسرے ہم عصروں کے لیے کہا ہے۔

لگتے ہیں حاسدوں کے یوں دل میں بیت میرے
سینے میں دشمناں کے جوں ذوالفقار آوے

---

[1] نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو' لاہور' ۱۹۶۰، ص ۱۱۱

[2] عبدالسلام ندوی، شعرالہند، حصہ اول، اعظم گڑھ، طبع سوم ۱۹۴۲ء، ص ۲۲

[3] ایضاً ص ۲۲

'آب حیات' میں محمد حسین آزاد نے ولی اور ناصر علی سرہندی کی چشمک کا ذکر کیا ہے۔ ناصر علی سرہندی 'علی' تخلص کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ولی نے اپنی شاعرانہ تعلی کے ساتھ ساتھ ان پر چوٹ کی:

اچھل کر جا پڑے جوں مصرع برق
اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں

ناصر علی نے جواب میں کہا ؎

باعجاز سخن گر اوڑ چلے وہ
ولی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں

پھر حاشیے میں لکھتے ہیں کہ 'موخر الذکر شعر عزیز دکنی کے دیوان میں درج ہے۔ شاید ناصر علی پر اسے یہ چوٹ بری لگی ہو۔ اس لیے جواب میں یہ شعر کہا۔ لوگوں میں ناصر علی کے نام سے مشہور ہے'' [۱]

مرزا علی لطف نے حاتم اور نعیم اللہ نعیم کے معرکے کا ذکر کیا ہے۔

"نعیم تخلص اور نعیم اللہ نام متوطن شاہ جہاں آباد معاصر محمد حاتم حاتم تخلص کا تھا چنانچہ اکثر مشاعروں میں گفتگوئیں طنز و ایما کی ان کے درمیان آتی ہیں اور مکرر غزلیں انھوں نے باہم لڑائی ہیں۔ ایک دن محمد حاتم نے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی۔ اور مطلع میں غزل کے طنز محمد نعیم پر کی ؎

جس دن سے کوئے یار کا حاتم مقیم ہے
بدتر اے خزاں سے بہارِ نعیم ہے

جب دورہ پڑھنے کا محمد حاتم تک پہنچا تو انھوں نے بھی مطلع۔ غزل یہ پڑھا

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے۔ آب حیات ص ص ۹۳، ۹۴

طلب نہ ہو تو سلیماں کی کچھ بھی خاتم ہے
لب سوال نہ ہووے تو ہیچ حاتم ہے

آبرو اور مرزا مظہر جانِ جاناں میں بھی آپس میں خوب چلتی تھی۔ مرزا مظہر کا شمار اس دور کے قابلِ احترام اور برگزیدہ شخصیتوں میں کیا جاتا تھا۔ وہ نقشبندی سلسلے کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ ان کی پاکیزگی اور تقدس کی بڑی شہرت تھی۔ مگر یہاں وہ بھی دوسرے شاعروں کی طرح حمام میں ننگے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض موقعوں پر گالی گلو سے بھی نہیں چوکتے۔ آبرو ایک آنکھ سے معذور تھے۔ مرزا مظہر نے انھیں چھیڑا[۱]

آبرو کی آنکھ میں ایک گانٹھ ہے
آبرو سب شاعروں کی الخ.....

شاہ آبرو نے بھی اس کا جواب اسی انداز میں دیا۔

کیا کروں حق کے کئے کو کور میری چشم ہے
آبرو جگ میں رہے تو جانِ جاناں بسم ہے

سودا نے بھی مرزا مظہر کی ہجو کہی تھی۔ اور ان کی ریختہ گوئی کو نشانہ بنایا تھا۔

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ
سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ
واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹ کا
سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ
اور ریختہ بھی ہے تو فرزشہ کی لاٹ کا
القصہ اس کا حال یہی ہے جو سچ کہوں
کتا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

---

[۱] مرزا علی لطف، گلشن ہند، عبداللہ خاں، حیدرآباد، ۱۹۰۶ء، ص ۳۴ - ۲

احسن دہلوی نے آبرو پر چوٹ کی تھی ۔ غالباً آبرو نے جواب نہیں دیا ۔

غزل اس طرح سے کہنی بھی احسن تجھ سوں بن آئے
جواب اب آبرو کب کہہ سکے مضمون بہتر سول

حاتم نے ناجی کے متعلق کہا ۔

سخن میں فخر اپنا بن کئے رہتا نہیں ناجی
اسے سمجھائے حاتم کس طرح اشعار کہہ کہہ کر

سودا کے زمانے میں یہ روش حدِ اعتدال سے تجاوز اختیار کر گئی ۔ میر ضاحک اور سودا نے تہذیب کو بالائے طاق رکھ کر دہ نخش نگاری کی ہے کہ توبہ توبہ ۔

خلیق انجم اس معرکے کی ابتدا یوں بیان کرتے ہیں ۔

ضاحک ہر شخص کی ہجو کہتے تھے ۔ ان میں بعض لوگ سودا کے ملنے والے بھی تھے یہ بات انھیں ناگوار گزری اور انھوں نے ضاحک کی ہجو کہہ دی ۔ اس معرکے کی ابتدا غالباً اسی ترجیع بند سے ہوئی ۔ چند جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کچو میری ہجو تو اے بھڑوے منٹ
تو سہی دو دن بانس سے تجھ کو الٹ

آخری شعر بتا رہا ہے کہ ضاحک نے ابھی تک سودا کی ہجو نہیں کہی تھی اور ضاحک نے جو میر نواب ، ان کے بھائی ، مرزا پھلو ، مرزا علی ، اور معالج خاں وغیرہ کی ہجویں کہی تھیں ، وہ سودا کو ناگوار گزریں ۔ اور یہی ناگواری ہجو گوئی کی ابتدا کا سبب بنی ۔[۱]

اب اس معرکے کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں ۔

---

[۱] خلیق انجم ، مرزا محمد رفیع سودا علیگڑھ ۱۹۶۶ ، ص ص ۳۱۶ ، ۳۱۷

میر ضاحک۔

اتنا آگے کبھی سودا نہ ہوا تھا سو ہوا
بنگلے میں بیٹھ کے رسوا نہ ہوا تھا سو ہوا
گو کہ وہ ماہ ہوا پیش دے عزت کم
شاعروں بیچ چو تھیلا نہ ہوا تھا سو ہوا

۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک ہجو میں سودا کے کتوں کے شوق پر طنز کیا ہے۔

اوس کا سارے سگوں سے ناتا ہے
ایک سفرہ پہ ساتھ کھاتا ہے
کلوا اور جھبرا لینڈی اور تازی
سب شریک طعام ہم بازی
کلوا کلہ چبائے جاتا ہے
اوجھڑی جھبرا ساتھ کھاتا ہے

سودا۔

ریم سوزاک پدر ہے تو شریر
رحم مادر سے الٹ نکلا میر
ضحاک کا کیوں نہ وہ پرواز کرے زیر فلک
پہنچیں پشت سے ہو نطفہ کی ملت جس تک

سودا نے اس پھکڑ بازی میں میر ضاحک کی اہلیہ کو بھی نہیں بخشا

ضاحک کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر دھرایا
بے وجہ رات ساری ہمسائیوں کو جگایا

بیٹھک میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب بلایا
تب شیخ سدو اس پر اماک کھا کر آیا
بولا کہ کیوں بے ناحق بکرا کوئی منگایا

مرزا فاخر مکیں اور فدوی سے بھی سودا کی معرکہ آرائیوں کا یہی حال تھا۔ مرزا فاخر مکیں نے سودا کی شاعرانہ صلاحیتوں کا مذاق اڑایا ہے۔

نہ دید از خود فروشی دشمن ما جنس بہبودے
بیازار جہاں دارد عبث سودائے بے سودے

سودا نے "عبرت الغافلین" ایک رسالہ لکھا جس میں فاخر مکیں کی شاعری پر سخت نکتہ چینی کی۔ فدوی اور سودا کے اہانت آمیز اشعار بھی دیکھئے۔

کچھ کٹ گئی ہے پیٹی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا
دم داب سامنے سے وہ اڑ چلا لٹورا — فدوی

بھڑوا ہے مسخرا ہے سودا اسے ہو لبے

سن بے الو ہر پنچ کے ہنگالے — سودا
ماده سگ آپ کو تو بنوا لے
میرے تئیں گو ہے اسکے ذوق بہ سگ
سگ بہت خوب میں نے ہیں پالے

اس کے علاوہ نو بندوں کے ایک مخمس میں فدوی کو طرح طرح سے "بنے" کا الو" ثابت کیا ہے۔

بعد کے دور میں ہم صرف انشا اور مصحفی کے معرکے کی مثال پر اکتفا کریں گے اردو کے ادبی معرکوں کی روایت میں یہ اپنی طرز کا واحد معرکہ ہے۔ اگرچہ یہ معرکہ دو شاعروں کے درمیان تھا لیکن اس میں بادشاہ، امرار، خواص، عوام سبھی شامل تھے

یہ معرکہ اپنی روایت کا نقطۂ عروج (CLIMEX) کہا جاسکتا ہے۔ بقول آزاد اس میں وہ خاکہ اڑا ہے کہ شائستگی نے کبھی آنکھیں بند کرلیں اور کبھی کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ یہ واقعہ جہاں دلچسپ ہے وہاں عبرت آموز بھی ہے۔ معرکہ کا آغاز وہی معاصرانہ چشمک سے ہوتا ہے۔ پھر طرحیہ غزلیں لکھی جاتی ہیں۔ سنگلاخ اور مشکل ترین زمینوں میں اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے جاتے ہیں۔ طرفین سے اعتراضات کی بوچھار شروع ہو جاتی ہے۔ ادبی مناظرے ہوتے ہیں۔ بعد کو آپس کی تو تو میں میں سے لے کر ہنگامہ آرائی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ دونوں جانب سے شہدوں کے لاؤ لشکر چڑھ کر آتے ہیں اور وہ گھمسان کا رن پڑتا ہے کہ کسی کو اپنی خبر نہیں رہتی۔ شہر کوتوال بھی اس جھگڑے میں مداخلت کرتا ہے۔ بالآخر بادشاہ کو یہ قصّہ چکانا پڑتا ہے۔ اس معرکہ میں دونوں حریف، ان کے شاگرد، شہر کے شہدے، درباری مصاحبین، تماشائی، شہر کوتوال اور بادشاہ بھی شامل ہیں۔ اس کا مختصر خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

مرزا سلیمان شکوہ کے کلام پر پہلے شیخ مصحفی اصلاح دیا کرتے تھے لیکن جب سید انشا دہلی آئے تو انھوں نے شہزادے کو بہت متاثر کیا۔ یہی ان دونوں کے معرکوں کا سبب ہوا۔ ابتدا میں موقع بہ موقع ایک دوسرے پر چوٹیں رہیں۔ لیکن ایک مشاعرے میں جب مصحفی نے اپنی غزل پڑھی تو اس نے عجب گل کھلایا۔

زہرہ کی جو آئی کفِ ہاروت میں انگلی
کی رشک نے جا دیدۂ ماروت میں انگلی

اس کا مقطع تھا

تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہ پس از مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

سید انشاء کی بھی غزل ہوئی۔

دیکھ اس کی پڑی خاتم یاقوت میں انگلی
ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی

مشاعرہ ختم ہوا تو لوگوں نے خوب خوب جدت طرازیاں کیں ایک شعر جو اس جھگڑے کی جڑ ثابت ہوا یہ ہے۔

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ
رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

اس شعر نے جوش میں چنگاری کا کام کیا مصحفی نے مشتعل ہو کر ایک فخریہ غزل کہی

ہر سفلہ را زبان دہیان تو کے رسد
آرے توئی فنائی دیا ہائے شاعری

انشاء نے بھی جوش میں آکر کہا ۔

یوں خاطرِ شریف میں گزرا کہ بزم میں
کچلا ہوا شریفہ غزل کو بنائیے
ایسے نجس کثیف قوافی سے نظم میں
دندان ریختہ پہ پھپھوندی جمائیے
سرکار کی یہاں نہیں گلنے کی دال کچھ
ردی جو کھائی ہو تو جناب جائیے

منتظر اور گرم جو مصحفی کے شاگرد تھے استاد کی حمایت میں انشا کے مقابلے پر پر آئے۔ انشا نے مصحفی کی ہیئت گدائی میں ایک شعر پڑھا تھا۔

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے
سر خرس کا، منہ خوک کا لنگور کی گردن

مصحفی نے انشا پر چوٹ کی ایک مصرع تھا۔

باندھے دم تنبور میں لنگور کی گردن

نکتہ یہ ہے کہ سید انشا اپنے گلے میں ایک دوپٹہ ڈالے رہتے تھے جس کے سرے گردن میں آگے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ اب معاملہ میں کچھ سنجیدگی آگئی۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے کے کلام پر اعتراضات ہونے شروع ہو گئے۔ اور خوب جم کر مناظرے ہوئے۔ یہاں طوالت کے خوف سے صرف دو مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

انشا

اچھلی ہوئی ورزش سے تری ڈنڈ پہ مچھلی
ہے نام خدا جیسے سقنقور کی گردن

اعتراض مصحفی

میں لفظ سقنقور مجرد نہیں دیکھا
ایجاد ہے تیرا یہ سقنقورہ کی گردن

مصحفی

دل کیونکہ پری حور کا پھر اس پہ نہ پھسلے
صانع نے بنائی تری بلور کی گردن

اعتراض انشا

بلور اگر درست ہو لیکن ضرور کیا
خواہی نخواہی اس کو غزل میں کھپائے

اس ادبی مناظرے اور منظوم تنقید و تنقیص کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ معرکۂ گرم نے شہدوں اور لچوں کو اکسایا۔ اور اپنے استاد کی طرف داری میں ایک

پورا لشکر تیار کیا اور انشا کو ذلیل کرنے نکلے۔ لیکن انشا نے کمال متانت سے اس بلائے ناگہانی کو ٹال دیا۔ ان لوگوں کی خوب خاطر مدارات کی ہنس ہنس کر سب کچھ سنا۔ اور آخر میں بڑی خنداں پیشانی سے انھیں رخصت کیا۔ لیکن اس کے بعد انشا نے اسکا خوب جواب دیا۔ آزاد لکھتے ہیں۔

انشا نے جو اس کا جواب حاضر کیا وہ قیامت کا تھا۔ یعنی ایک انبوہ کثیر برات کے سامان سے ترتیب دیا اور عجیب وغریب ہجویں تیار کر کے لوگوں کو دیں۔ کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے۔ کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک ہاتھ میں گڈا۔ ایک میں گڑیا۔ دونوں کو لڑاتے تھے۔ زبانی ہجویں پڑھتے جاتے تھے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن
لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن"۔ [1]

آخر میں مصحفی کو کہنا پڑا

واللہ کہ شاعر نہیں تو بھانڈ ہے بھڑوے

مصحفی کے شاگردوں نے پھر ایک جلوس انشا کے خلاف نکالنا چاہا۔ مگر شہر کوتوال نے خبر پا کر نقض امن کے خوف سے اسے روک دیا

اس معرکہ کی کثافت اور سوقیت درحقیقت اردو کی پیشانی پر ایک بد نما داغ ہے۔ ایک معرکہ اور قابل ذکر ہے۔ جو اپنے درد ناک انجام کی وجہ سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خواجہ میر درد کے شاگرد محشر اور جرأت کے شاگرد نبلت میں اکثر نوک جھونک رہتی تھی۔ ایک مرتبہ فریقین کو ایسا طیش آیا کہ

---

[1] آب حیات ص ۳۲۵

جوش میں تلواریں نکال لیں۔ محشر مارا گیا اور دہلت فرار ہو گیا۔ کئی برس کے بعد جب دہلت وطن واپس آیا تو محشر کے رشتہ داروں نے اسے بھی مار ڈالا

یہ ہیں وہ واقعات جن سے اردو ادب کی تاریخ بھری پڑی ہے فارسی گو شعرا بھی اگرچہ ان معرکہ آرائیوں میں نہایت سوقیت اور رکاکت کا مظاہرہ کرتے تھے، بلکہ بقول مولانا شبلی الوری اور سوزنی کی وجہ سے یہ زبان ہجو کی زبان بن گئی تھی۔ مگر اردو میں ان کی سطح اور بھی پست ہو گئی۔ یہاں شاعروں نے نہ دانشمندی سے کام لیا نہ ضبط و تحمل سے۔ رقابت اور حسد کی آگ میں اسقدر اندھے ہوئے کہ شائستگی اور تہذیب کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اپنا نفع و نقصان بھی نہ دیکھا۔ انجام کی پروا کئے بغیر میدان کارزار میں اتر آئے بہرحال اس روایت سے جہاں اردو ادب کا دامن جگہ جگہ سے داغدار ہوا ہے وہاں اس کو فائدہ بھی پہنچا۔ آزاد لکھتے ہیں۔

"ان معرکوں کے بعض حالات مناسب حال لکھتا ہوں۔ اگرچہ ان میں بھی اکثر باتیں خلاف تہذیب ہیں۔ مگر فن زبان کے طلب گاروں کا خیال اس معاملے میں کچھ اور ہے۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ نظم اردو میں چند خیالات معمولی ہیں۔ اور بس۔ عام مطالب کے ادا کرنے میں قوت بیانیہ کا اثر نہایت ضعیف ہے ہاں ہجو کا کوچہ ہے کہ اس میں ایک چٹنک جو شاعر کے دل کو لگی ہوتی ہے تو وہ تاثیر کلام سے مل کر سوتے دلوں کی بغل میں گدگدی کر جاتی ہے۔ بیان میں صفائی اور زبان میں گرمی و طراری پیدا کرنی چاہو تو ایسے کلاموں کا پڑھنا ایک عمدہ اوزار زبان کے تیز کرنے کا ہے۔"[1]

---

[1] آب حیات ص ۱۶۔۳

مصحفی اور انشا نے کچھ قطعات ایک دوسرے کے کلام کے عیوب ظاہر کرنے کے لیے اور اپنے اشعار کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے تصنیف کیے تھے۔ مثال کے طور پر انشا کا وہ قطعہ جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

"سن لیجیے گوش دل سے مرے مشفقا یہ عرض۔ ناحق نہ یوں غصہ سے مت تھرتھرائیے"

اور مصحفی کا وہ قطعہ،

"اے آنکہ معارض ہو مری تیغ زباں سے۔ تو نے سپر عذر میں مستور کی گردن"

ان قطعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں: "ان دونوں قطعوں کو پڑھنے سے معلوم ہو گیا کہ دونوں باکمال ادائے مطلب پر کس قدر قدرت رکھتے تھے۔ بیشک عام لطف بیان اور خاص طنزوں کے نشتر سید انشا کی ترجیح کے لیے سفارش کریں گے مگر بڈھے دیرینہ سال نے جو اسی غزل کی زمین میں مطالب مطلوبہ کو ادا کر دیا ہے۔ یہ قدرت کمال شاید اسے پیچھے نہ رہنے دے"[1]

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ ان معرکہ آرائیوں میں شاعر کا لب و لہجہ اگرچہ کافی تیکھا اور تلخ ہو گیا ہے، جس کی غیر شائستگی، رکاکت اور سوقیت بعض اوقات گراں معلوم ہوتی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ زبان کی شوخی طراری، بے محابہ قدرت بیان قابل داد ہے۔ ایک دوسرے کی ہیئت کذائی کے مناظر جس ظریفانہ انداز میں کھینچے گئے ہیں وہ پر لطف بھی ہیں اور بامزہ بھی۔ ایک جانب مصحفی اور دوسری طرف کا کھسیانہ پن بھی دلوں کو گدگداتا ہے۔ اور ہم اس رنگینی گفتار میں ندرت کلام دیکھ لیتے ہیں جس کی طرفگی اور کمال فن ہم کو متحیر کر دیتی ہے علاوہ ازیں ان ادبی معرکوں کے تحت جو ادب وجود میں آتا ہے اس کی بھی

---

[1] آب حیات ص ۳۲۳

اہمیت ہے۔ یہ ادب جہاں شاعر کی شخصیت اور انفرادیت کے تجزیے
میں ہماری مدد کرتا ہے۔ وہاں اس دور کی طرزِ معاشرت، تہذیب و تمدن،
اور سماجی اقدار کا بھی بھرپور علم دیتا ہے۔ زبان و بیان میں تنوع اور
وسعت پیدا کی ہے اور بہت سے تلخ و شیریں تجربات کا بھی ادبی زندگی میں
اضافہ کیا ہے۔

میر کا مزاج

اردو ادب میں میرؔ ایک ایسی قد آور اور عظیم شخصیت کا مالک ہے جس کو ہر باکمال شاعر اور صاحبِ فن نے بلالحاظ دور و عصر عقیدت کے نذرانے پیش کیے ہیں۔ اس نے اپنے زمانے میں بھی اپنی عظمت کا لوہا منوایا اور بعد میں بھی ہر ایک دور کے استادانِ فن سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ انتہا یہ ہے کہ آج جب کہ فن کی قدریں کافی بدل چکی ہیں میرؔ کی شاعری کا اعتراف اسی شد و مد اور بلند آہنگی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پرانے دور کے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کو شعرائے اردو میں ایک بلند مقام عطا کیا۔ اور آج بھی تاریخ ادب اردو کا مورخ اور نقاد ان کے کلام کو ادب عالیہ میں شمار کرتا ہے۔ ان کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لیے صرف یہی بات کافی ہے کہ تقلیدِ میرؔ اردو شاعری کی ایک مستقل روایت بن گئی چناں چہ آج بھی جدید ترین غزلوں میں میرؔ کی جذباتیت اور ان کا لب و لہجہ عام روش کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ میرؔ کے کلام کی طرح ان کی شخصیت اور بلند کرداری بھی قابلِ احترام رہی ہے۔ میرؔ کی خودداری، توکل اور قناعت قابلِ ستائش ہے۔ انھوں نے نااہلوں کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا۔ زندگی کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔ کبھی لالچ سے یا مفلسی کے دکھ سے خلافِ ضمیر کوئی کام نہیں کیا۔ ان کی اسی بان اور پاس وضعداری نے ان کو سماج میں

باوقعت بنایا اور انھیں ایک پر وقار شخصیت بخشی

یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ میر جہاں اپنی اس اعلیٰ و ارفع سیرت کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں ممتاز ہیں وہاں وہ اپنی مخصوص افتاد طبع اور نازک مزاجی کی وجہ سے بعض کوتاہیوں کے لیے مورد الزام بھی ٹھہرے میر کی بے نیازی کم آمیزی، بے تکلفی اور بے دماغی کی عام شکایتیں ہیں۔ لوگوں نے میر کی اس مخصوص ذہنی روش کو ان کے کبر و غرور سے تعبیر کیا ہے مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"میر صاحب کی بلند نظری اس غضب کی تھی کہ دنیا کی کوئی بڑائی اور کسی شخص کا کمال یا بزرگی انھیں بڑی نہ دکھائی دیتی تھی۔ اس قباحت نے نازک مزاج بنا کر ہمیشہ دنیائی راحت اور فارغ البالی سے محروم رکھا۔ اور وہ وضعداری اور قناعت کے دعوے ہیں اسے فخر سمجھتے رہے۔ یہ الفاظ گستاخانہ جو زبان سے نکلے ہیں۔ راقم روسیاہ ان کی روح پاک سے عفو قصور چاہتا ہے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا فقط اس لیے کہ جن لوگوں کو دنیا میں گزارا کرنا ہے وہ دیکھیں کہ ایک صاحب جوہر کا جوہر یہ باتیں کیونکر خاک میں ملا دیتی ہیں۔"[1]

پھر لکھتے ہیں۔ "سب تذکرے نالاں ہیں کہ اگر یہ غرور اور بے دماغی فقط امرا کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی۔ افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی انھیں دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ امر ایسے شخص کے دامن پر نہایت بد نما دھبا ہے جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نیکوکاری کا خلعت پہنے ہو"[2]

---

[1] آب حیات، ص ۲۰۴ [2] آب حیات، ص ۲۱۶

میر کے ایک مشہور سوانح نگار اور نقاد ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی فرماتے ہیں۔
در اصل یہ ہے کہ میر کی سیرت اور کلام میں بہت سے تناقضات ملتے ہیں
بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میر ہیں ایاز کی غیرت، حمیت، شرافت
کشادہ قلبی اور پاک مشربی کی مثال نہیں دوسرے بے دماغ اور مغرور ہے۔ وہ اپنے
آگے کسی کو نہیں سمجھتا۔" [1]
ایک دوسری جگہ نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی رائے سے اختلافات
کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔
"نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا میر کو منکر المزاج بنا یا یہ کہنا کہ ان کے
قلم سے کوئی ایسا لفظ نہیں نکلا جس سے ان کی خود بینی، خود پسندی، بد دماغی،
اور تعلی عیاں ہوتی ہو کسی طرح صحیح نہیں۔ صرف آزاد ہی نہیں ناصر یکتا اور
قاسم نے بھی ان کی نازک مزاجی کا ذکر کیا ہے میر حسن لکھتے ہیں۔
"بسیار صاحب دماغ است بد دماغ اور رامی زیبد۔" [2]
میر قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ مجموعۂ نغز میں میر کے ترجمہ میں لکھتے ہیں
"اما بنا بر خوئے کہ در سرش جا گرفتہ از یں امر کہ فی الحقیقتہ۔ خوئے است
ابا و کلی بمیان آمدہ از نبرد غرور شایہ بر طرازم کہ حصہ دار دراز نخوت د غرور
سرایش بر نگارم کہ سینہ۔ حقائق نمی نگارد۔" [3]
سید احمد خاں یکتا دستور الفصاحت میں رقمطراز ہیں۔

---

[1] خواجہ احمد فاروقی "میر تقی میر حیات اور شاعری۔ علی گڈھ ۱۹۵۴ء ص ۱۴۳
[2] ایضاً ص ۲۹۲
[3] میر قدرت اللہ قاسم مجموعہ نغز جلد دوم مرتبہ محمود شیرانی لاہور ۱۹۳۳ء ص ۲۳۰

(۵) [illegible]

جناب میر بغرور یکماں واستغنائے متصوف کہ منظر بخاطرش بودہ اکثر کم التفاتی و بے اعتنائی بحال مردم می نمود[1]

ڈاکٹر فاروقی تذکرہ "نوش معرکہ زیبا" میں سعادت خاں ناصر کے تحریر کردہ واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"مرزا معلی سبقت کہتے تھے۔ جب میر صاحب لکھنؤ میں تشریف لائے بندہ ان کے شرف ملازمت کو گیا۔ خبر ہونے کے بعد دیر میں تشریف لائے۔ میں نے دولت قدم بوسی حاصل کیا اور بعد قیل وقال کے ملتمس ہوا کہ کچھ اپنے کلام سے مستفید فرمائیے۔ بے تامل فرمایا کہ تمہارے بشرے سے شعر فہمی معلوم نہیں ہوتی سخن کے ضائع کرنے سے حاصل؟

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ناصر نے لکھا ہے۔

ایک دن شاہ قدرت اللہ اور میر صاحب کشتی پر سوار تھے۔ قدرت اللہ نے چند غزلیں اپنے دیوان کی میر صاحب کے آگے پڑھیں۔ میر صاحب نے کچھ نہ کہا۔ وہ ملتمس ہوا کہ آپ کے کچھ نہ فرمایا۔ میر صاحب نے کہا۔ صواب بر یہ ہے کہ دیوان کو اپنے دریا میں ڈال دو۔[2]

ان تمام واقعات کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ میر انتہائی غیور اور نازک مزاج تھے اور یہی نازک مزاجی ان کے کبر و غرور، نخوت، خود بینی، اور انانیت کی شکل میں ظاہر ہوتی۔

میر کی زندگی اور ان کے زمانے کے حالات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا

---

[1] سید احمد خاں یکتا، دستور الفصاحت تصحیح امتیاز علی خاں عرشی طبع اول ص ۱۰۴ ص ۹۱۔
[2] میر تقی میر حیات اور شاعری ص ص ۹۰، ۹۱

ہے کہ ان کے ذہن شعور اور دل و دماغ پر بہت سے خارجی موثرات کا کافی گہرا اثر پڑا تھا اور ان کی یہ مزاجی کیفیت انہیں اثرات کا نتیجہ تھی۔

میر کا زمانہ وہ تھا جب مغل سلطنت زوال پذیر تھی اور مرکزی حکومت کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ صوبیدار خود مختاری کا دعویٰ کر رہے تھے۔ نادر اور ابدالی نے سر اٹھا رکھا تھا۔ قدم قدم پر جھگڑے فساد برپا تھے۔ سکھ، روہیلے، جاٹ، مرہٹے اور انگریز موقع پا کر اپنے قدم آگے بڑھا رہے تھے۔ یہ ایک بڑی سلطنت کا زوال تھا جس نے اس دور کی سیاست ہی نہیں بلکہ اقتصادی، اخلاقی اور معاشرتی پہلوؤں کو بھی اثر انداز کیا تھا لوگوں میں بے اطمینانی، خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ اخلاقی معیار پست ہو رہے تھے۔ زندگی کی اعلیٰ قدریں اور تہذیب و تمدن کے پرانے ضابطے ٹوٹ رہے تھے۔ لوگ بے روزگاری، عسرت اور تنگ معاشی سے پریشان تھے۔ ان حالات میں توکل، قناعت اور تقدیر کے عقائد پر یقین بڑھا۔ دنیا سے بے زاری بڑھی اور زندگی کی جدوجہد کی رفتار دھیمی پڑی۔ دنیا کی بے ثباتی کا شدید احساس ہونے لگا۔ میر کی زندگی اور ان کے مزاج پر اس دور کے انتشار اور بربادی کا گہرا اثر پڑا۔

میر کے بچپن، لڑکپن، اور زمانہ شباب کے واقعات نے بھی ان کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ بچپن میں دو شخصیتوں کے زیر تربیت رہے ان میں ایک تو ان کے والد میر محمد علی متقی تھے اور دوسرے ان کے چچا (منہ بولے) سید امان اللہ۔ یہ دونوں بزرگ درویش منش تھے۔ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے اور صوفیانہ عقاید پر یقین رکھتے تھے۔ میر نے توکل، بے نیازی، کم آمیزی، تجرد، شغل اور عزلت گزینی انہیں بزرگوں کی تربیت سے حاصل کی۔ والد کے

انتقال کے بعد میر کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ابھی کم عمر تھے اور باپ نے ان کے لیے کوئی ترکہ نہ چھوڑا تھا۔ نتیجہ میں بالکل بے سہارا ہو گئے یہ وہ بے کسی تھی جس کا اثر بہت مدت تک ان کے ذہن میں رہا۔ میر ابھی اس غم کو نہ بھولے تھے کہ ان کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے ان کو ستانا شروع کر دیا۔ اور جب یہ تنگ آکر اپنے ماموں سراج الدین خاں آرزو کے پاس چلے گئے تو ان کو بھی لکھ بھیجا کہ میر فتنہ روزگار ہے اس کی اعانت مناسب نہیں اس پر خان آرزو نے بھی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اب میر بالکل بے یار و مددگار ہو گئے۔

میر کا زمانہ شباب بھی تلخیوں سے ہمکنار رہا۔ معاش کی تنگی، عشق ناکام کی خردسیاں اور زمانے کی بے مہری ان کی حساس طبیعت کے لیے بہت اذیت ناک تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو عملی لحاظ سے ان میں زندگی سے نباہ کرنے اور مشکلوں سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کی صلاحیت ابھر ہی نہ سکی۔ دوسری طرف وہ اپنے غلط ماحول سے مصالحت بھی نہیں کر سکے۔ اس طرح ان کی نخوت کوشی اور بغاوت ایک عجیب ذہنیت لیے ہوئے دماغی ہیں تبدیل ہو گئی۔ یہ میر کا انفعالی رنگ تھا۔ ان کا حواس باختہ رہنا، دوسروں کی طرف التفات نہ کرنا، خلوت نشینی اختیار کر لینا اسی خامی کا نتیجہ ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے میر کی آشفتہ مزاجی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے

"اس آشفتہ مزاجی کے سرچشمے دراصل میر کے احساس انفرادیت سے ابلتے ہیں۔ ان کی فطرت کی گہرائیوں میں ایک زبردست کشمکش جاری تھی۔ ایک طرف ان کے تحت الشعور کی دنیا میں اپنے کمال اور عظمت کا ایک توانا احساس موجود تھا۔ دوسری طرف شکست اور بے کسی کا خیال بھی ان کو

مغلوب کیے جاتا تھا۔" [1]

پھر کہتے ہیں۔

"ان کی فطرت کی عمیق گہرائیوں میں شاید کشمکش جاری تھی۔ ایک ہنگامہ برپا تھا۔ وہ احساس بے کسی کے نیچے دبے ہوئے تھے اور اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ اس تضاد اور اندرونی خلفشار اور پیکار کو حل نہیں کر سکتے۔ نتیجہ یہ کہ وہ الجھتے رہتے تھے اپنے آپ سے، اپنے معاصرین سے۔ اپنے زمانے سے، زمین سے، آسمان سے مگر اس کا سبب دریافت نہ کر سکتے تھے۔

اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میر تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

⁂

تیری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے" [2]

میر کی بد دماغی دراصل اسی اندرونی الجھاؤ کا خارجی اظہار ہے۔ اسی کے سبب ان کی انانیت بڑھی اور اسی کی وجہ سے وہ خود پسندی کا شکار ہوئے اور بقول ڈاکٹر فاروقی صاحب "اس اندرونی پیکار نے جو ان کے خارج اور باطن میں مسلسل جاری تھی ان کے کمال فن کے احساس کو بہت تیز کر دیا تھا۔" [3]

میر کی یہ افتادِ طبع وہ تہذیبی اقدار کے تصادم کا نتیجہ بھی تھی، میر جن تصورات

---

[1] ڈاکٹر عبداللہ، نقد میر، لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۹۷

[2] نقد میر، ص ۸۰

[3] میر تقی میر، حیات اور شاعری ۳۱۱

اور معتقدات کے حامل تھے عملی زندگی میں ان کو کسی حد تک برقرار نہ رکھ سکے انھوں نے علی متقی، میر ناصر علی عندلیب اور خواجہ میر درد کی صوفیانہ تعلیم اور درویشانہ صحبت سے بزرگی کا احترام، حفظ وضعداری، علم و فن کی قدر شناسی، توکل اور قناعت کا سبق سیکھا اور ان پر ایمان بھی رکھتے تھے لیکن درباری ماحول میں انھوں نے نہ بزرگی کا احترام پایا اور نہ علم و فن کی توقیر دیکھی۔ دربار کی غیر معتدل غوغائیوں اور بے باکیوں کو وہ خلاف ادب سمجھتے تھے۔ مگر اس کا تدارک نہ کر سکتے تھے۔ اسی طرح تلاش معاش میں کبھی انھوں نے در بدر کی ٹھوکریں کھائیں دربار داری کو نبھانے کی کوشش کی، شکارنامے اور قصیدے لکھے امرا کی ستائش اور مدح بھی کی۔ جنھوں نے ان کی وضعداری کو بھی صدمہ پہونچایا اور صبر و قناعت کو بھی ٹھیس پہونچائی۔ اسی کشمکش اور ذہنی اذیت ناکی کی وجہ سے وہ پریشانی کا شکار رہے اور مزاج میں حلم و تدبر اور ضبط کا جوہر نہ پیدا کر سکے۔ اسی احساس نے ان کی انفرادیت کی لے کو اتنا بڑھا دیا کہ وہ دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے۔

ان تمام اسباب و علل کی بنا پر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ میر ایک پروقار اور بلند مرتبہ سیرت کے مالک تھے اور اپنے شاعرانہ کمال میں کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بہت سے امور میں اپنے فخر و افتخار کو نبھا نہ سکے بلکہ بعض اوقات دیدہ دانستہ بہت سی لغزشوں اور کمزوریوں کے مرتکب ہوئے جن کو بآسانی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل میں ہم میر کی ان خامیوں کا جائزہ لیں گے۔

بے دماغی

میر کی کم آمیزی، کم اختلاطی، گوشہ نشینی، بے نیازی اور خلوت نشینی کو بے دماغی پر محمول کیا جاتا ہے۔ اردو کے بہت سے تذکرہ نگاروں نے

ایسے واقعات کی نشان دہی کی ہے جس سے اس امر کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے اکثر سخن فہم اور سخن گو حضرات میر سے ملنے کے لیے ان کے گھر پر آئے ہیں مگر میر نے نہ صرف یہ کہ ان کی فرمائش پر انھیں اپنے کلام سے محروم رکھا۔ بلکہ ان کے منہ پر ان کو اس کا نا اہل بھی قرار دیا۔

بد دماغی

میر کی نازک مزاجی، بد دماغی کی حد تک بڑھ گئی تھی۔ اسی بد دماغی نے انھیں نہیں کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ نہ وہ درباری ماحول کا ساتھ دے سکے، اور نہ اپنے ساتھیوں سے نباہ کر سکے۔ ایک مرتبہ میر نے کسی بات پر ناراض ہو کر دربار جانا چھوڑ دیا تھا۔ آزاد لکھتے ہیں

"چند روز کے بعد ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے نواب کی سواری سامنے آ گئی دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا کبھی تشریف بھی نہیں لاتے میر صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں، یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ غرض بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے اور نفقر و فاقے میں گذارہ کرتے رہے۔"

غرور و نخوت

میر کے مزاج میں بد دماغی کے ساتھ ساتھ خود بینی، خود پسندی اور انانیت بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس کا اظہار ان کے کلام کے ذریعہ بھی ہوا اور معاصرین کے برتاؤ میں بھی۔ جرأت نے جب اپنی ایک کامیاب غزل کسی شعری محفل میں داد چاہی تو انھوں نے کہا کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ

---

۵۴ آب حیات، ص ۲۰۷

نہیں جانتے ہو اپنی چڑھا چڑھائی کہہ لیا کرو"۔ [1]

اسی طرح میر قمر الدین منت اور سعادت یار خاں رنگین کو بھی شاعری کے لیے نااہل قرار دے دیا۔ [2]

مثنوی "اژدر نامہ" بھرے مشاعرے میں پڑھی جس میں اپنے آپ کو اژدہا اور معاصرین کو سانپ بچھو، کیڑے مکوڑے بتا کر ان کی تحقیر کی۔

مری قدر کیا ان سے کچھ ہاتھ ہے
جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے
کہاں پہنچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر
کیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

تحقیر آمیز رویہ

میر نے اپنے تذکرے "نکات الشعراء" میں بہت سے شاعروں کا ذکر نہایت تحقیر اور تذلیل سے کیا ہے۔ جو کسی طرح بھی ان کی متانت کو زیب نہیں دیتا۔

مثلاً خاکسار کے متعلق لکھتے ہیں:

"بسیار سفلگی می کند بلکہ از تنک آبی بنائے ریختہ را بآب رسانیدہ.. محمد معشوق کنبوہ کہ مردے است تائب میر جعفر بسیار گرم جوش۔ یار باش چوں شنید کہ خاکسار کلو ہم نام دارد بداہت گفتہ مصرع:-

کتا ہے دیر یار کا کلو اس کا نام

---

[1] میر قدرت اللہ قاسم، مجموعۂ نغز مرتبہ محمود شیرانی لاہور ۱۹۳۳ء، ص ۱۵۶

[2] تفصیل دیکھیے "آب حیات"، ص ۲۱۷

چوں کلمہ اکثر نام سگھانی گزارند لطف بہم رسانید۔ سر گردم لائیہ او ریدہ است میداند نحز او ہمہ بر ریختہ است۔ طرفہ ایں کہ ایں ہم نام خود نامے خود او ہم نا درست ہال

فضل علی دانا کی ہیئت کذائی کا ذکر بھی بہت ہی مضحکہ خیز طریقے پر کیا ہے جس سے اس کی سبکی مقصود ہے

"اتفاقاً در یوم ہولی تاریخ پانزدہم کہ مجلس خانہ فقیر مقرر است و اضحح شدہ۔ میاں دانا نیز تشریف داشت۔ پیرہن بر لباس مجھے یک تنی سیاہ بر کردہ کہ اذالطف تا بزانو بود۔ چوں در رنگ ذات شریف در رسش از حد زیادہ نا سبزہ و سیاہ بود، زار فنغ کر سبالی گزشت بجرد مشاہدہ کردن او گفت کہ "یا سید ہولی کا ریچھ آیا" کہ بزبان فارسی خرس ہولی میتوان گفت۔ چوں در ہندوستان رسم است کہ در آں روز بار راجیف و اطفال وغیرہ ہم خرس و بوزنہ و اسپ و شتر برائے خوشی ہم دیگر می سازند، ایں لطیفہ بسیار بموقع افتاد، بلکہ صورت گرفت"[2]

اسی طرح حاتم کے ایک شعر پر اصلاح دی ہے۔

حاتم —

با ئے ہے دور سے ملا کیوں تھا   آ گئے آ با مرے کیا میرا

میر —

مبتلا آتشک میں ہوں اب میں   آ گئے آیا مرے کیا میرا

اصلاح کے بعد لکھتے ہیں۔

"پیش گرمی ایں مصرعہ دو خنکی آں شعر روشن است"[3]

---

[1] میر تقی میر: نکات الشعرا، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۳۵، ص ۱۱۴

[2] نکات الشعرا ص ۱۲۸، ۱۲۹

[3] نکات الشعرا ص ۷۶، ۷۷

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ گروہ اپنے معاصرین کی ہنسی اور تحقیر کرنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔

بے دردی یا فقدان رواداری

میر نے اپنے زعم شاعری میں اپنے معاصر شعراء کے کلام پر رائے زنی کرتے وقت رواداری سے کام نہیں کیا۔ ان کے لہجے کی تلخی اور ترشی بے باکی کا ثبوت نہیں بلکہ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میر نے شاعر کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ مثلاً حشمت کے ترجمے میں لکھتے ہیں۔

"اور شعر ریختہ کہ بسیار بے ہمیاندی گفت گہہ دارد حاصل عجب ہنگامہ پرداز بے بود ذات۔ میر کا یہی بے دردی ان کی اصابت رائے کو نقصان پہنچاتی ہے۔

انتہا پسندی ۔

میر کی انتہا پسندی کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ انھوں نے حاتم کو جاہل و نکمی کہا جبکہ میر حسن اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے انکی کافی تعریف کی ہے۔

تعصب ۔

میر کے زمانے میں یقین کو کافی شہرت حاصل ہوگئی تھی یہاں تک کہ لوگ ان کی طرزوں پر غزلیں کہا کرتے تھے تو وانے بھی یقین کے شعروں کی تضمین کی میر ان سے متعلق لکھتے ہیں۔

"بعد از ملاقات ایں قدر خود معلوم شد کہ ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد وشاید

لہ نکات الشعراء ص ۱۰۷

از ہیں راہ مردمان گمان تا در نسبت رجوع او باشند۔ جمع براین اتفاق دارند

کہ شاعری او خالی از لطف نیست۔"[1] یہ میر کا تعصب ہے۔ شعرائے دکن کو

بھی انھوں نے محض تعصب کی بنا پر تیسرے رتبہ کا کہا ہے اور ان کے حالات کی

تفصیل سے احتراز کیا۔

ذاتی کشمکش۔

میر کی ذاتی رنجش، سراج الدین خان آرزو کے تعلقات میں پورے طور پر جھلکتی ہے۔ اگرچہ بہت سے تذکرہ نگار اس بات کے شاہد ہیں کہ میر نے خان آرزو سے کسب فیض کیا تھا۔ مگر انھوں نے ذکر میر میں خان آرزو کو اپنا استاد نہیں مانا۔ اسی طرح تذکرہ کریم الدین میں خاکسار کو میر کا استاد بتایا گیا ہے۔ بچپن میں وہ انھیں سے اصلاح لیتے تھے مگر میر نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ بلکہ اس کی سفلگی کو ثابت کیا ہے۔

ذاتی مفاد

میر نے اپنے ذاتی مفاد اور مخصوص اغراض کی بنا پر بھی کچھ لوگوں کا ساتھ دیا اور کچھ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ اس کی مثال میں معارضہ مظہر و آرزو پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلیق انجم لکھتے ہیں۔

"میر جب دہلی آئے ہیں تو دو ادبی گروہ بہت نمایاں تھے۔ ذہنی اعتبار سے میر مظہر گروہ کے ساتھ تھے۔ مگر حالات نے انھیں آرزو کے قریب کر دیا تھا غالباً یہ ناممکن تھا کہ وہ آرزو کے ساتھ رہتے ہوئے ان کے مخالف گروہ میں شامل

---

[1] نکات الشعرا ص ۸۱

ہوجائیں۔

چونکہ ابتدا میں خود میر کی کوئی ادبی حیثیت نہیں تھی۔ اس لئے غیر جانبدار رہنا بھی ممکن نہیں تھا۔ پھر اسی دور میں، استاد کی بہت اہمیت تھی ورنہ سبے استادے کہلائے جاتے تھے۔ ممکن ہے کہ میر کو سعادت سے تلمذ ہو لیکن یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔ اس لئے میر کو آرزو کا سہارا لینا پڑا اور اپنی مرضی اور حقیقت کے خلاف استاد کہنا پڑا اور جب انھیں خود استادی مل گئی تو وہ حقیقت چھپانے سے قاصر رہے۔ ممکن ہے میر کے ذہن میں نکات الشعرا کی تالیف کا ادبی مقصد بھی ہو لیکن اس کی تالیف کا ایک مقصد مظہر گروہ کی مخالفت تھا۔[۵]

غلط بیانی

میر نے بعض مصلحتوں کی بنا پر جان بوجھ کر حقائق سے چشم پوسی اختیار کی ہے کہیں کہیں ان کے بیانات میں تضاد بھی ملتا ہے۔ ایک بیان کی دوسرے بیان سے تردید ہوجاتی ہے۔ کہیں وہ سراسر غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔

خلیق انجم لکھتے ہیں:۔

"واقعات اور حالات لکھنے میں میر کچھ زیادہ ایماندار بھی نہیں ہیں۔ وہ موقع کی مناسبت سے کچھ واقعات کی اختراع بھی کر لیتے ہیں۔"

اسی طرح میر کی آپ بیتی نثار احمد فاروقی نے کہا ہے:۔

"پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ اتنا کم سن بچہ درویش کے صوفیانہ اقوال کو اس طرح پیش کر سکے کہ تقریباً چالیس سال کے بعد جب وہ اپنی سوانحعمری لکھنے بیٹھے تو انھیں من وعن نقل کر دیے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ سارے واقعات میر کے اپنے ذہن

۵؎ خلیق انجم، مرزا مظہر جان جاناں، دہلی یونیورسٹی سنہ ۱۹۶۰ء ص ۱۵۰

کی اختراع ہیں۔ ممکن ہے کہ خارج میں احسان اللہ اور بایزید وغیرہ کا وجود رہا ہو لیکن اس سے جو ملفوظات روایت کیے گئے ہیں ان کا بیشتر حصہ جعلی اور اختراعی ہے"۔ [1]

میر نے نکات الشعراء میں آرزو کو اپنا استاد، پیر و مرشد کہا تھا لیکن ذکرِ میر میں ان الفاظ میں پہلے بیان کی تردید کرتے ہیں۔

"چندے پیش او زخان آرزو (ماندم و کتابے چند از یاران شہر خواندم"

یعنی وہ آرزو کو اپنا استاد تسلیم نہیں کر رہے ہیں۔ [2]

میر سعادت کے متعلق لکھتے ہیں۔

"آں عزیز مرا تکلیف موزوں کردن ریختہ .... کرد" [3]

حالانکہ نکات الشعراء میں ان کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے

"بابندہ ربط بسیار داشت" [4]

دربارداری

میر نے جہاں حفظ وضعداری اور پاس ناموس ذات کا بھرم رکھا اور کبھی طمع کی خاطر اپنے آپ کو امرا کے ہاتھوں نہیں بیچا وہاں تلاش معاش کے سلسلے میں ایسے بھی واقعات پیش آئے کہ دربان نے اندر جانے سے روکا اور وہ شرمندہ و ناکام واپس آئے۔ کبھی کبھی رئیسوں کے دربار میں ملازموں کی طرح حاضر رہے

---

۱ نثار احمد فاروقی، میر کی آپ بیتی، دہلی، ص ۱۱

۲ میر تقی میر، ذکرِ میر، ص ۶۳

۳ ایضاً، ص ۷۶

۴ نکات الشعراء، ص ۲۷

اور اس سے صرف اتنا ہوا کہ ان کی گزر اوقات ہوتی رہی۔

ستائش گری اور مداحی

"میر نے امراء اور نوابین سے حتی المقدور نباہ کی کوشش کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی مخصوص ذہنی کیفیت دیر تک اس کی متحمل نہ رہ سکی، جس کی وجہ سے وہ لکھنؤ میں بھی پریشان حال رہے۔ ورنہ انھوں نے دوسرے درباریوں کی طرح امراء کی بھی مداحی کی ہے اور ستائش بھی۔ میر کے شکار نامے اور قصیدے اس کے بین ثبوت ہیں۔

شکایتِ روزگار

میر وہ خوش نصیب شاعر ہے کہ جس کی وطن میں بھی قدردانی ہوئی اور وطن کے باہر بھی۔ دہلی میں میر کی کافی عزت تھی۔ ان کے فن کا اعتراف کر لیا گیا تھا لکھنؤ میں بھی عمائد شہر، امراء اور نواب میر کا مقام پہچانتے تھے، اور ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ لیکن باوجود اس کے انھیں اپنے زمانے سے شکایت رہی۔

خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں۔

"میر دہلی چھوڑ کر لکھنؤ گئے وہاں ان کی قدر کی گئی اور تین سو روپے ماہوار مقرر ہوگئے۔ آزاد کے اس بیان کی تردید کہ آخر میں ان کی تنخواہ بند ہوگئی تھی۔ مرزا علی لطف کے "تذکرے" سے ہوجاتی ہے ــــــ یہ اتنی بڑی تنخواہ ہے کہ غالب کو باوجود دعاگوئی اور مدح گستری کے دہلی اور رام پور سے میسر نہ آسکی، غالب کا ابتدائی زمانہ "شاہد و شمع و مے و قمار" میں گزرا تھا۔ میر درویش زادے تھے۔ فقر و فاقے کی تعلیم ابتدا سے حاصل کی تھی۔ ان کے لئے یہ تین سو روپے کم نہ تھے۔"[1]

---

[1] میر تقی میر، حیات اور شاعری، ص ۳۰۹

مختصر یہ کہ میرؔ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرے تھے۔ زمانے کے گرم و سرد نے انھیں بھی متاثر کیا تھا، اس لیئے جہاں صوفیانہ معتقدات نے ان کی کو اعلیٰ و ارفع اخلاق و خصائل سے بہرہ مند کیا وہاں انسانی زندگی کے مادی تقاضوں نے بھی انھیں مجبور کر دیا۔ اور یہ وہ صورتِ حال تھی کہ جس میں پھنس کر وہ پھر مکمل طور سے نجات حاصل نہ کر سکے ۔

———※———

میر کے ادبی معرکے

میر کی نازک مزاجی، خود پسندی، اور ان کی بڑھتی ہوئی انانیت نے انھیں کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ اپنی اسی افتادِ طبع کی وجہ سے وہ امرا اور نوابین میں بھی خوش گوار تعلقات قائم نہ رکھ سکے، اور اپنے معاصر شعرا سے بھی نالاں رہے۔ میر نے اپنی ذات، اپنے اجداد اور اپنے فن پر ہمیشہ فخر کیا ہے۔ ان کا یہ پندار انکی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ اور نثر میں بھی۔ "ذکرِ میر" میں انھوں نے اپنے والد کے صوفیانہ عقائد، اور درویشانہ زندگی کا ذکر نہایت عقیدت مندی اور جوش و خروش کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ان کے والد اپنے زمانے کے بڑے صوفی تھے۔ یہاں تک کہ امیر الامرا صمصام الدولہ بھی ان سے شرفِ ملاقات کا خواہشمند تھا۔ مگر چونکہ وہ امرا اور روسا سے ملنے میں بہت تکلف کرتے تھے اس لیے انھوں نے خود معذرت چاہ لی۔ اسی طرح "فیضِ میر" میں بھی انھوں نے کچھ فقیروں کے چشم دید واقعات پیش کیے ہیں۔ اور اپنے آپ کو صاحبِ کرامات فقیروں کی صحبت میں شریک دکھایا ہے۔ "نکات الشعرا" میں بھی ان کی خودنمائی صاف طور پر نمایاں ہے اس میں انھوں نے معاصرین کی سیرت اور ان کے کلام پر جابجا اعتراضات کیے ہیں۔ اب ان کی شاعری کو بھی لے لیجیے۔ یہ ان کا اپنا فن تھا۔ انھوں نے اس میدان میں کبھی بھی کسی کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھا۔

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا مستند ہے میرا فرمایا ہوا!!!

میر کو اپنی سیادت، قلندرانہ زیست اور اپنے مستند ہونے پر ناز تھا۔ ان کے معاصرین نے میر کے اسی فخر و مباہات پر ضربیں لگائیں۔ انھوں نے انکی سیادت کو کبھی نہیں مانا، بلکہ ان کا مذاق اڑایا۔ ان کے زہد و تقدس پر بھی حملے کیے۔ اور شاعری کے میدان میں بھی ان کے مقابلے پر آئے۔ میر نے بھی ان سب کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور کسی طرح ان سے شکست تسلیم نہیں کی۔

میر اور ان کے معاصرین کی یہ معرکہ آرائیاں دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں میر کی شخصیت کے بہت سے ایسے گوشے سامنے آتے ہیں جن پر ان کی عظمت کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اور جو عقیدت کے سبب نگاہوں سے اوجھل رہے تھے۔ ان سے اس دور کے معیار اخلاق کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور تہذیب و تمدن کے بہت سے ان دیکھے رنگ و روپ بھی ظاہر ہوجاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان حالات میں ایک باکمال شاعر کی پریشاں خاطری بھی ہماری ہمدردیوں کو ابھارتی ہے۔ ایک عظیم شاعر کے مقابلے پر کم رتبہ لوگوں کا خم ٹھونک کر آنا اور طرح طرح سے اس کی پریشانی کا سبب بنتا جہاں ایک نازیبا فعل ہے وہاں اس عظیم شاعر اور اس دور کا بھی المیہ ہے۔

میر کی دل برگشتگی کا سب سے مکمل اظہار ان کے تذکرے نکات الشعرار میں ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے معاصر شعرار کی ذاتیات پر بھی حملے کیے ہیں اور ان کے کلام کی بھی تنقیص کی ہے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے میر کی غرض گیر کی عیب جینی اور ہنر پوشی پر اعتراضات کیے ہیں۔ ان معترضین میں خاص طور پر فتح علی گردیزی (صاحب تذکرہ ریختہ گویاں) حکیم قدرت اللہ شوق (صاحب مجموعۂ نغز)، شفیق اورنگ آبادی (صاحب چمنستان شعرار) مولوی کریم الدین (صاحب طبقات الشعرار) اور مولوی محمد حسین آزاد (صاحب آب حیات) ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم کا تو یہاں تک خیال ہے کہ "ممکن ہے میر کے ذہن میں نکات الشعرا کی تالیف کا ادبی مقصد بھی ہو لیکن اس کی تالیف کا ایک اہم مقصد مظہر گروہ کی مخالفت تھا۔[۱]" "نکات الشعرا" کے مطالعہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ میر نے ذاتی رنجشوں کی وجہ سے بہت سے شاعروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

بقاؔ، بقاء اللہ

لہ شیخ بقاء اللہ نام اور بقاؔ تخلص تھا۔ حافظ لطف اللہ کے بیٹے تھے۔ وطن اکبر آباد تھا۔ لیکن نوجوانی میں لکھنؤ آکر رہنے لگے تھے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی ایک اچھے خوشنویس تھے۔ حاتمؔ کے شاگرد تھے۔ دردؔ سے بھی اصلاح لی تھی فارسی کلام مرزا ناصر مکیں کو دکھاتے تھے۔ حاتم ہی کے مشورے پر انھوں نے بقا تخلص اختیار کیا تھا۔ اس سے پہلے غمیں تخلص کرتے تھے۔ نہایت خلیق، ظریف اور فارغ قسم کے انسان تھے۔ ان کی طبع شوخ ہجو کی طرف بھی مائل تھی۔ اسی وجہ سے دہلی میں میرؔ اور لکھنؤ میں سوداؔ سے معرکے ہوتے قصیدے بھی اچھے کہتے تھے۔ بلکہ بعض تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ اس زمانے میں سوداؔ کے علاوہ کوئی اور قصیدہ گوئی میں ان کے ہم پلہ نہیں۔ سید احمد علی خاں یکتا "دستور الفصاحت" میں لکھتے ہیں۔

"شاعر قصیدہ گو گزشتہ، لہٰذا بمقابلہ مرزا محمد رفیع در قصائد جوابش داد معنی یابی و تشابیہ غریبہ دادہ۔ از متاخرین کسے ہمسر از دے او نبود" لہ

لہ بقا۔ دیوان بقا مرتبہ خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی ص الف تا ج سے حالات زندگی لئے گئے۔
لہ سید احمد علی خاں یکتا۔ دستور الفصاحت، بتصحیح امتیاز علی خاں عرشی رام پور ۱۹۴۳ء ص ۸۰

سعادت خاں ناصر نے تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں لکھا ہے۔

"حاتم کے شاگرد تمام رفیع سودا سے رجوع لائے۔ مگر بقا کہ نام حاتم کا لیوا تھے۔ بقا ہا منکر سودا غائب ہو یا حاضر بلکہ اہانت سودا کی اوس کے کلام سے ظاہر اور میر تقی میر سے بھی نا صاف، غلطی کا اوس کی اعتراف، ہر دو نہر گوار کی مذمت سے آلودہ اور خامہ معظمہ ہجو پر فرسودہ رکھتا تھا۔" [1]

آخر عمر میں ان پر جنونی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اسی عالم میں انھوں نے ہجو گوئی سے توبہ کرلی۔ وحشت کم ہونے پر عازم بیت اللہ ہوئے۔ لطف کے قول کے مطابق انھوں نے یہ سفر سنہ ۱۲۰۶ھ مطابق سنہ ۱۷۹۱ء میں کیا تھا۔ اور اسی سفر کے دوران انتقال کر گئے تھے [2] انھوں نے ایک دیوان یادگار چھوڑا جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے، دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے 'دیوان بقا' شائع ہوگیا ہے۔

بقا کے متعلق مصحفی نے لکھا ہے: "طبع شوخش بطرف ہجو بسیار مائل افتادہ۔ در شاہجہاں آباد با میر و در لکھنؤ با مرزا معرکہ گیر ہا کردہ و دقت طبع خود را ظاہر نمودہ" [3] یعنی ان کی طبیعت میں شوخی تھی ہجو کی طرف بہت زیادہ مائل تھے۔ دہلی میں میر اور لکھنؤ میں مرزا کے ساتھ معرکہ گیر رہے اور ان میں اپنی دقت طبع کا ثبوت دیا۔ دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ مگر ان کی مقابلہ بازیوں کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا۔ بلکہ بعض انھیں اس نامد اخل پر ملامت بھی کرتے ہیں۔ لطف لکھتے ہیں۔

"فی الحقیقۃ عزیزِ نکتہ سنج و باریک بیں و معنی بند و سخن آفریں تھا۔ میرزا رفیع سودا

---

[1] خوش معرکۂ زیبا، قلمی لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری ورق ۱۳۱ بحوالہ خواجہ احمد فاروقی دیوان بقا مرتبہ دلی یونیورسٹی میں مہتاج۔ [2] مرزا علی لطف "گلشن ہند" عبداللہ خاں ۱۹۰۶ء ص ۱۷

[3] مصحفی، تذکرہ ہندی مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ص ۴۳

تخلص کے منہ اکثر چڑھتا۔ اور اس نہنگ بحر معانی کی ہجو میں کچھ کچھ واہیات لکھا۔ لیکن مرزائے مرحوم نے مطلق اعتنا نہ کی، اور یہ بات کہی کہ میں نے جس کی ہجو کی، نام اس کا اسی تقریب سے تمام عالم میں ہوا مشہور ہے، سو تیری ہجو نہ کروں گا۔ کہ تیرا مشہور کرنا مجھے نہیں منظور ہے۔" [1]

کلیات سودا میں بقا کے خلاف کوئی ہجو نہیں ملتی۔ غالباً اسی خاموشی سے ان کا یہی منشا تھا کہ بقا کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔

قدرت اللہ قاسم نے بھی بقا کو جہاں "درست فکر، خوش گو، شیریں گفتار، معانی جو" کہا ہے وہاں ان.. اس روش پر سخت سست بھی کہا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"ہجو ہر کس بے محابا (کذا) مباورۃ می جوید۔ با سر آمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا و سخن سنج بے نظیر محمد تقی میر طرف شدہ (تخطیہ نمودہ) بہجو ایشاں پرداختہ سزائے کردار ناہنجار ایں عزیزاں بواجبی در کنار نہادہ زبان زد خاص و عام ساختہ کہ مرزا ہجو ہر کس بے ہیچ خیلے دلیر بودہ واز دست میر با ایں ہمہ قابلیت عناں جوہر قابل شناسی گبرد خود خویش در ربودہ" [2]

بقا کو اپنی پرگوئی پر بہت ناز تھا۔ انھوں نے سودا کے مقابلے میں بہت سی سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی اور اپنا لوہا منوانے کے خیال سے میر اور سودا جیسے استادوں کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی۔ مگر ان کو یہ مرتبہ حاصل نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہو کہ آتش حسد میں ان لوگوں کی ہجووں پر اتر آئے اور ان کو برا بھلا کہہ کر اپنے دل کا غبار نکالتے رہے۔

---

[1] گلشن ہند، ص ۱۱
[2] حکیم قدرت اللہ، مجموعہ حصہ اول، مرتبہ محمود شیرانی لاہور ۱۹۳۳ء، ص ۱۰۷

بقا اور میر کے معرکہ کی ابتدا بڑی دل چسپ ہے۔ ایک ذرا سی بات نے اتنا طول کھینچا کہ دونوں آپے سے باہر ہو گئے۔ بقا تو پھر بھی شوخ مزاج تھے اور ظریفانہ طبیعت رکھتے تھے ان کی بے اعتدالی غیر متوقع بھی نہ تھی۔ مگر دیکھنا تو یہ ہے کہ میر جیسا سنجیدہ اور متین شخص بھی غیظ و غضب سے بھڑک اٹھا۔ اس بات سے صورتِ حال کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس معرکہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک مرتبہ بقا نے "دوآبے" کے مضمون کے دو شعر کہے تھے۔

ان کی آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے
دوآبہ جہاں میں یہ مشہور ہے
سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں
ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

میر صاحب نے بھی اسی مضمون کو اپنے اشعار میں ادا کیا۔

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

بقا نے جب یہ شعر سنا تو بہت بگڑے۔ اور میر کو خوب برا بھلا کہا۔

میر نے تو ترا مضمون دوآبے کا لیا
پر بقا تو یہ دعا کر جو دعا دینی ہو
یا خدا میر کے دیدوں کو دوآبہ کر دے
اور بینی یہ بہا اس کی کہ ترِ بینی ہو

لہ تفصیل دیکھئے۔ آبِ حیات، ص ۲۲۲

ہوسکتا ہے کہ میر نے یہ قطعہ سن لیا ہو۔ انھوں نے ایک اور شعر کہا۔ اس میں اگرچہ انھوں نے اسی خیال سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر میر کے تخیل کی ندرت نے ایک دوسری اچھوتی تشبیہہ کا پیکر اختراع کیا جو کسی طرح سے توارد یا سرقہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ اور اس طرح یہ ثابت کیا کہ وہ سرقہ پر منحصر نہیں ہیں، بلکہ بے پناہ تخلیقی قوت کے مالک ہیں۔ شعر یہ ہے۔

میں راہِ عشق میں تو آگے ہی دو دلا تھا
پر پیچ پیش آیا قسمت سے یہ دو راہا

اس شعر سے بقا کے سمندِ ناز پر ایک اور تازیانہ لگا۔ پھر کیا تھا۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور ان کے پیچھے ایسے ہاتھ دھو کر پڑے کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔

یک چند میر جی نے ہم کو لگا کے لہرے
پھیکے کئے ہمارے جتنے تھے شعر گہرے
آخر کو میر اپنے مضموں کے دزد ٹھہرے
سنتے کہیں نہ ہو دیں، شیطاں کے کان بہرے

آگے چل کر انھوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک مثنوی بھی میر کی ہجو میں لکھ ڈالی جس کا نام "میناز میر" رکھا۔ اس مثنوی میں اکیس[۱] اشعار ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ میں نے ریختہ کا ایک محل وہ آب پر تیار کیا تھا۔ میر وہاں اس نئے مضمون کو چرانے کے ارادے سے آیا۔ مگر اب یہاں سے نکل کر کہاں بھاگے گا۔ چور

---

[۱] دیوان بقا ص ص۔ ۷۶،۷۵

بری طرح پکڑا گیا۔ ہر طرف پانی ہے اور دوآبے کے کناروں پر تنظروں کے مگرمچھ موجود ہیں۔ اور اگر بالفرض محال یہ اژدہا یعنی میر (مثنوی اژدرنامہ مصنفہ میر کی رعایت سے) مجھ پر حملہ بھی کریگا تو میں سحر (طلسم شاعری) کے ذریعہ اس کو "مینار میر" میں بند کردوں گا پھر جو کوئی راہ گیر اس طرف سے گزرے گا تو وہ اس مینار کے قریب آکر یہی کہے گا۔

یہ مینار وند بد افعال ہے
جو چوری کرے اس کا یہ حال ہے

اس مثنوی کا پس منظر یہ بھی ہے کہ میر نے اپنی مثنوی "اژدرنامہ" سے طنز و تضحیک کے وہ تیر برسائے تھے جو ابھی تک معاصرین کے دلوں میں پیوست تھے۔ ظاہر ہے میر کو اژدہے سے تعبیر کر اسی مثنوی کی طرف اشارہ ہے۔

اس طرح میر پر چوری کا الزام ثابت کرکے اب انھیں ان کے کلام پر نکتہ چینی کرنے کا موقع مل گیا۔ لیکن یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ ان کے ساتھ بے چارے سودا کی بھی بری طرح گت بنی۔ حالانکہ قرائن اس حق میں ہیں کہ سودا نے اس سلسلے میں خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

فرماتے ہیں

مرزا و میر باہم دونوں تھے نیم ملّا — فن سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقا اب ہجووں کی ریسماں سے — دونوں کو بارہ باہم میں نے کیا ہے پورا

اب ان اعتراضات کو بھی دیکھیے جو ان کی شاعری پر کیے گئے ہیں۔

عیب ہے گرچہ کثرت یک لفظ — سخن فارسی سے تا ہندی
پسج ا ہے تمام عالم سے — طور سودا و وضع میر تقی

یعنی واں لفظ 'تو' ہے، یہاں کلام کی بھرتی ہی '، ہے پرکن شعر
کھول دیوان دونوں صاحب کے اے بقا ہم نے جب زیارت کی
شعر سودا و میر کے دیکھے وہ 'تو' 'تو تو' کریں میاں یہ 'ہی ہی'

بقا کے نزدیک میر اور سودا دونوں شاعری کے فن میں ادھورے ہیں۔ ان کی خام کاری اور ناپختگی کا یہ بھی ثبوت ہے کہ وہ بقا جیسے شاعر کے کلام سے سرقہ کرلیا کرتے تھے۔ لہٰذا ان کی یہ خامی ہجووں کے تازیانے لگا کر ہی دور کی جا سکتی ہے۔ پھر ان کے یہاں جو کثرت یک لفظ' ہے وہ بھی قابل اعتراض ہے۔ دونوں کے اشعار میں چستی نہیں؛ بھرتی کی بھرمار ہے۔ تماشہ یہ کہ بھرتی کے الفاظ بھی مخصوص ہیں۔ ایک کے یہاں 'تو' ہے اور دوسرے کے یہاں 'ہی'۔ اگرچہ بقا کے یہ اعتراضات سراسر غلط اور بے جا ہیں مگر اس قطعہ میں طنز و مزاح کی کیفیت ملتی ہے۔

یار لوگوں نے بقا کو ان ہجویہ اشعار اور قطعات پر خوب خوب داد دی۔ پھر کیا تھا، وہ عام غزلوں کے اشعار میں بھی ان استادوں پر کھل کر چوٹیں کرنے لگے۔

یہ ریختہ جس ڈھن سے بن آیا ہے بقا خوب
یاروں نے تو کیا کیا نہ کئے تیر سے حملے

ش

ہے جیسی بقا کی غزل، ایسی نہ ہو مضبوط
سودا جو کوئی ریختے کے گھر پہ کرے پچ

ش

جس میں یاران بزم ہوں محظوظ یوں بقا میں غزل سرائی کی
میر بھی ورنہ خوب کہتے ہیں کاٹتے جیب ان کی دائی کی

'یاران بزم' کو اپنی اس غزل سرائی سے محظوظ کرنے کی کوشش میں بالآخر وہ بھی

حد سے بڑھ گئے۔ اب معاملہ شعر و سخن تک محدود نہ رہا۔

میر صاحب پھر اس سے کیا بہتر — اس میں ہووے جو نام شاعر کا
لے کے دیوان پکارتے پھرئیے — ہر گلی کوچے کام شاعر کا

اس کے بعد ان کی ذات پر بھی حملے کرنے لگے۔ میر نے اپنے کلام میں اپنی سیادت کا ذکر بڑی شد و مد کے ساتھ کیا ہے۔

غیرت سے تنگ آئے غیروں سے لڑ مریں گے
آگے بھی میر سید کرتے گئے ہیں ساکا

⁂

منکر نہیں ہے کوئی سیادت کا میر کی
ذات مقدس ان کی یہی ذات ہو تو ہو

⁂

بقا نے ان کو سید نہیں مانا۔ ان کے خیال میں وہ خود سید بن بیٹھے۔ اس سیادت کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہیں۔

ڈرتا ہوں گر گسوں کا نہ ہو میر ناشتہ — رنڈی کا سو کھڑ ساکھ بنا ہے گماشتہ
دیکھو تو کس طرح سے کھلاتا ہے تیجیاں — صید افگناں رہے ہے اصید گذاشتہ
دہقاں تھا تو تو شیخ سے سید یہ کیوں ہوا — تو اہم زمیں میں گر نہ ہوا تخم کاشتہ
یکچند تا رہے ورق دہر پر بقا — کر ایسی ہجو آب طلا سے نگاشتہ

اور آخر میں تو وہ میر کو خبردار کرتے ہیں کہ اپنی وضع درست کیجے ورنہ کوئی دل چلا ٹھیک نہ کر دے۔

توبہ زاہد کی توبہ تلی ہے
چلتے بیٹھے تو شیخ چلی ہے

پگڑی اپنی سنبھالئیگا میر
اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

میر جیسا نازک مزاج ان باتوں کو کیوں کر برداشت کرسکتا تھا۔ ضبط کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ انھوں نے اس کے جواب میں ایک سو دس اشعار کی ایک ہجو لکھی۔ پھر انھوں نے نہ اپنے وقار کا خیال کیا اور نہ شائستگی کا۔ جو زبان پر آیا کہتے چلے گئے۔ اس ہجو یہ مثنوی کا عنوان ہے" ہجو نااہل مسمی بہ زبان زد عالم" بقا کی ہجو انھوں نے عاجز آ کر لکھی تھی۔ اس کا پہلا شعر ہی کہے دیتا ہے کہ وہ تنگ آ چکے تھے۔ شعر کا انداز کچھ ایسا ہے جیسے کوئی دوستوں کو دہائی دے کر کسی ظالم سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔

سنیو اے اہل سخن بعد از سلام
چھیڑتا ہے مجھ کو اک تخم حرام

اس کے بعد ان شاعروں کو ملامت کرتے ہیں جو انھیں بے وجہ چھیڑتے تھے۔ جب کہ میر نے انھیں ہمیشہ درگزر کیا ہے۔ ہجوگوئی ان کے نزدیک ایک کم درجہ کی چیز تھی۔ جو باوقار لوگوں کی شان کے شایان نہیں۔

میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار ۔۔۔ کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار
گر کسھوں نے کچھ کہا میں چپ رہا ۔۔۔ ہجو اس کی ہوگئی اس کا کہا
کیا ہو اگر چاند پر پھینکیں ہیں خاک ۔۔۔ پڑتی ہے ان سب کے منہ پر میں ہوں پاک

ان اشعار میں میر کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے خود کسی کی ہجو نہیں کی بلکہ وہ اسکو ایک اخلاقی جرم سمجھتے تھے۔ مگر جب بقا کی ہجوؤں کا طومار بندھ گیا۔ اور وہ سخت

لے اگرچہ اس مثنوی میں بقا کا نام صاف طور پر نہیں لیا گیا، مگر اندرونی اور خارجی
بقیہ آگے

پریشان ہو گئے تو ان کو بھی اس اخلاقی جرم کا مرتکب ہونا پڑا۔ لیکن اس ارتکاب جرم سے پہلے اپنی صفائی ضروری سمجھتے ہیں۔

نہ ہو شاعر کچھ نہیں میرا گناہ　　مدعی ہے ہیچ ہے یہ روسیاہ
تھا تحمل مجھ کو بس درویش تھا　　دردمند و عاشق و دل ریش تھا
کیا کروں پر لاعلاجی سی ہے اب　　غصے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تپ

اس کے بعد انھوں نے اپنی استادی کا ذکر کیا ہے اور پھر بقا کو آڑے ہاتھوں لیا

میں نے پاس اس کا کیا حد سے زیاد
پر کمی کرتا ہے کب یہ ابن زیاد
فتنہ کہیے کہتے پاجی ہو گیا
پاس ظاہر چھوڑ پاجی ہو گیا

پھر بقا کی ہیئت کذائی کا مضحکہ اڑایا ہے۔

گذشتہ سے پیوستہ

شہادتوں کی بناء پر محققین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ یہ بقا کی ہجو ہے۔

اظہر راہی اپنے مضمون "میر کی ہجویہ شاعری" میں لکھتے ہیں۔

"دوسری مثنوی جس کا عنوان "ہجو نااہل مسمی بہ زبان زد عالم" ہے۔ یہ بقا کی ہجو میں ہے۔ نسخہ حیدرآباد میں۔ بجائے "نااہل" کے "بے ادب" لکھا ہے۔ اور رام پور میں کلیات میر کے مخطوطے میں اس مثنوی کا نام "در ہجو محمد بقا" ہے۔ بحوالہ نثار احمد، دہلی کالج میگزین میر نمبر ۱۹۶۲ء دہلی ص ۱۸۸، قاضی عبدالودود بھی اس کو بقا کی ہجو تسلیم کرتے ہیں۔

بے شبہ بقاء اللہ خاں بقا کی ہجو ہے۔ اشعار منقولہ سے ثابت ہے کہ

بقیہ آگے صفحے پر

اونٹ کی خلقت پہ ہے قدرت کو ناز — اس کی خلادت کب ہے کیا اے بے نیاز
ہیئت اس کی شکل سے سرانگ ہے — جیسے عوج بن عنق کی ٹانگ ہے
سر کے تئیں اس کے جو دیکھیں کر نگاہ — بانس پر ایک انڈا رکھا ہانڈی سی سیاہ

مدعی میرا ہوا یہ بے ہنر — مردہ صد سال سے بے نوتر

اس کے ساتھ ان کے باپ کی بھی خبر لی۔ اور خوب کھری کھوٹی سنائی۔

باپ اس کا سخت ناداں نادرست — گوشے کی سی گندی بلی ناق وست

اس ہجو میں میر نے مغلظات اور رکاکت کی حد کر دی ہے۔ بے تامل گالیوں پہ اتر آئے ہیں۔

عقل سے کس طرح ہوئے بہرہ ور — کسو حافظ کا نطفہ پاچہ خر

یہ میر کے غصہ کی انتہا ہے۔
آخر میں یہ کہہ کر سکون پاتے ہیں۔

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

گذشتہ سے پیوستہ
معاصر شاعر میر کے مقابلے میں نومشق تھا (۲) اس کا باپ حافظ تھا (۳) اس زمانے میں جب میر دہلی میں دوبارہ مستقلاً مقیم ہوئے، یہاں کسی دوسری جگہ سے آیا تھا (۴) اس نے میر کی ہجو کہی تھی۔
بحوالہ قاضی عبدالودود معیارستان ۱۹۵۷، پٹنہ، ص ۱۴۳

میرؔ کلیات میر ص ص ۱۰۲۲ تا ۱۰۲۷ مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، کراچی ۱۹۵۸ء ص ص ۱۰۲۲ تا ۱۰۲۷

بقاؔ نے اس ہجو کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ پچاس اشعار کی ایک مثنوی میرؔ کی ہجو میں لکھی۔ جس میں اس نے اپنے دوستوں کو مخاطب کر کے کہا کہ لو اور سنو۔ ابھی تو تم نے میرؔ کے "اژدرنامے" کا قصہ سنا تھا۔ اب ایک اور تازہ ہجو سنو جس میں اس نے اپنی پوچ گوئی کا ثبوت دیا ہے

قصۂ اژدر رہا بالائے طاق — تازہ اک اشلک ہوتی ہے اتفاق

یعنی اس نے سن کے ہجو تازہ کی — پوچ گوئی اپنی پر آوازہ کی!!!

پھر وہ میرؔ کی تذلیل کرتے ہیں

میرؔ ہے یا نطفۂ شیطاں ہے یہ — اس قدر جو درپۓ انساں ہے یہ

اس مثنوی میں انھوں نے ایک قصہ بیان کیا ہے کہ ایک صاحب میرے پاس آئے۔ بہت زیادہ اداس تھے۔ جب میں نے پوچھا تو فرمانے لگے کیا کہوں گیتکی نامی میری ایک کنیز ہے۔ اس پر ایک بھتنا عاشق ہو گیا۔ اور وہ روز اس کے پاس رات کو آتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ بے چاری دن بدن جھڑتی جا رہی ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے مجھے یہ قصہ سنایا تو میں نے اس سے کہا کہ آج چولھے میں ایک اینٹ گرم کر رکھنا۔ جب وہ آئے تو اسے اسی اینٹ پر بٹھانا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ جیسے ہی وہ اینٹ پر بیٹھا اس کے دونوں سرین جل گئے۔ اور وہ یہ کہتا ہوا بھاگا۔

واہ بی بی گیتکی تم زندہ ہو
اب جو ادھر آئے گا ننڈو چوہا ہو

میں بھی اس کی تاک میں لحاف اوڑھے پلنگ پر بیٹھا تھا۔ میں نے اس کو

لـہ دیوان بقا، ص ص ۷۴ تا ۷۸

بھاگنے نہیں دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔ اس کے تمام حملے تو لحاف پر ہوتے تھے لیکن میرا ہاتھ سیدھا اس کے منہ پر پڑتا تھا۔ آخر بس ہی پیچھا چھڑا کر بھاگا۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا آیا۔ اگر یقین نہ ہو تو دیکھ آؤ دروازہ پر کھڑا ہوگا۔ بقا کہتے ہیں کہ جب اسے جا کر دیکھا تو وہ میر تھا۔ پھر ان اشعار پر مثنوی ختم کرتے ہیں۔

دیکھتا کیا ہوں کہ میر استادہ ہیں — اس کے سر چڑھنے پہ یہ آمادہ ہیں
آپ پر پہلے پڑھائیں نے حصار — پیچھے ٹالا ان کو پتھر مار مار
کر بقا اس بات کا یاروں میں ذکر — تا کریں جلدی وہ اپنی اپنی فکر

یہ اس معرکے کا نقطۂ عروج تھا۔

ان ہجوؤں میں بقا کے مقابلے میں میر کا لب و لہجہ بہت زیادہ تلخ اور تیکھا ہے۔ ان کے یہاں طنز کم ہے اور لعن طعن زیادہ۔ غصے کی حالت میں گالی گلوچ کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کو برا کہتے کہتے ان کے والدین کو بھی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ بقا کے یہاں عداوت کا غبار نہیں۔ البتہ طنز کے نشتر زیادہ آبدار ہیں۔ وہ پہلے میر کی عزت کرتے تھے۔ اور انھیں قبلہ کہہ کر پکارتے تھے جیسا کہ خود میر نے اپنی ہجو میں بتایا ہے۔

قبلہ کہتے کہتے حاجی ہو گیا — پاس ظاہر چھوڑ پاجی ہو گیا

یہ میر کی اسی لعن طعن کا نتیجہ ہے۔۔ ورنہ ان کی ہجوؤں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بقا میر کو چھیڑ چھیڑ کر خود بھی ہنس رہے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنسا رہے ہیں۔ جبکہ میر کھسیا کھسیا کر انھیں گالیاں سناتے ہیں اور دوسروں سے ان کی حرکتوں کی شکایت کرتے ہیں۔ بقا نے میر کی ہیئت کذائی کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں طنز و ظرافت کی چاشنی موجود ہے۔ اس کے برعکس میر نے

بقاؔ کا صرف منھ ہی چڑایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس جھگڑے میں پہل بقاؔ کی طرف سے ہوئی۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اس میں شدت اور تلخی میرؔ نے پیدا کی۔“

حاتم، ظہور الدین

نام شیخ ظہور الدین تھا اور حاتم تخلص والد کا نام فتح الدین تھا۔ شاہ جہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ شاہ حاتم پہلے سپاہی پیشہ تھے اور عمدہ الملک امیر خاں کے مصاحب تھے۔ چونکہ محمد شاہی دور حکومت تھا۔ اس لیے اس وقت کے نوجوانوں کے جو شوق ہوا کرتے تھے وہ انھوں نے پورے کیے۔ بعد کو میر بادل علی شاہ کے تکیہ میں جانے لگے تھے اور درویشانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔

حاتم نہایت مہذب اور متین تھے۔ کافی عمر پائی تھی۔ بہت خوش مزاج اور نہایت خلیق و ظریف انسان واقع ہوتے تھے۔ راج گھاٹ کے رستہ میں قلعہ کے نیچے شاہ تسلیم کا تکیہ تھا۔ وہیں پر شعر و ادب کی نشست گاہ تھی۔ روزانہ شام کو وہیں جا کر بیٹھا کرتے تھے۔

شاہ حاتم نے ولی کے دیوان سے متاثر ہو کر شاعری شروع کی۔ پہلے رمز تخلص کرتے تھے۔ پھر حاتم تخلص اختیار کیا۔ طبقہ اول کے شاعر تھے۔ ان کا کلیات کافی ضخیم تھا۔ اس لیے انھوں نے اسی کلیات سے ایک مختصر انتخاب بنام "دیوان زادہ" مرتب کیا۔

ان کی شاعری میں روزمرہ کو کافی دخل تھا۔ اشعار عاشقانہ بھی کہتے

لہ آب حیات ص ۱۰۷ تا ۱۰۹ سے حالات زندگی لیے گئے۔

تھے اور عارفانہ بھی ۔ زبان شستہ اور رفتہ تھی ۔ فارسی میں بھی ان کا ایک دیوان تھا۔
۹۶ برس کی عمر میں ماہ رمضان ۱۲۰۷ھ میں دہلی میں فوت ہوئے ۔ اور وہیں دلی دروازے کے باہر دفن ہوئے ۔ بقول مصحفی ۱۲۰۶ھ میں انتقال ہوا۔ اور ۸۳ برس کی عمر پائی ۔

حاتم اور میر کے تعلقات سمجھنے کے لیے ہم پہلے نکات الشعراء اور بعد کو دوسرے تذکروں کے بیانات کا جائزہ لیں گے ۔ میر نے نکات الشعراء میں حاتم کا ذکر اس طرح کیا ہے ۔

" حاتم ، تخلص از شاہ جہاں آباد است ۔ می گوید کہ من با میاں آبرو ہم طرح بودم مرد لیست جاہل و تمکن ، مقطع وضع ، دیر آشنا اغنا ندارد بعد و دریافتہ نمی شود کہ ایں رگ کہن (کذا) بسبب شاعری است ، کہ ہمچو من دیگرے نیست ، یا وضع او ہمیں است ، خوب است ۔ مارا بایں ہا چہ کار ، شعر بسیار دارد ۔ دیوانش تا رسیدن ہیم بدست آمدہ لیکن ، پارۂ اشعار آں نگاشتہ می شوند ۔ با من ہم آشنائے بیگانہ است " [۱]

میر کی تحریر اور ان کے انداز بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے یہاں انتہا پسندی سے کام لیا ہے ۔ ہر ایک لفظ سے میر کی ناگواری کا اظہار ہو رہا ہے ۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حاتم سے دل برداشتہ ہیں ۔ بقول شاعر

تری رنجش کھلی طرز بیاں سے
نہ تھی دل میں تو کیوں نکلی زباں سے

اب ذرا میر سے ہٹ کر دوسرے تذکرہ نگاروں کی رائے بھی دیکھئے ۔ میر حسن

---

[۱] نکات الشعراء ص ۷۵

حاتم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

شاعرے ست، صاحب کمال و پسندیدہ افعال، عالی فطرت، بلند ہمت، معاصر میاں آبرو۔ دو دیوان ترتیب دادہ یکے بہ زبان قدیم بہ طور ایہام دوم بہ زبان حال اوائیہ شہرہ اشعارش بسیار ست۔ اکثر غزل ہائے او نغمہ سرایان ہند می خوانند۔"[۱]

میر حسن کا یہ بیان میر کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں ان کے اخلاق کی برائی کی انتہا ہے۔ یہاں ان کے اوصاف حمیدہ کا ذکر ہے۔ وہاں ان کی ریختہ گوئی کا ذکر صرف 'شعر بسیار دارد' کی شکل میں ہوا ہے۔ یہاں یہ حال ہے کہ 'نغمہ سرایان ہند' اس سے مست ہو رہے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ہم دوسرے لوگوں کے خیالات کا بھی جائزہ لیں تاکہ حقیقت روشن ہو سکے۔

مرزا علی لطف لکھتے ہیں۔

"ہم عصر شاہ نجم الدین آبرو اور مرزا رفیع سودا کا۔ شاعر خوش بیان تھا۔ صاحب دیوان تھا۔ ایک دیوان میں نہایت خرچ ایہام کیا ہے اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع ہے، طور متاخرین اور طرز ایہام کا۔"[۲]

مصحفی فرماتے ہیں۔

"بنائے شعر بندی را بہ ایہام گوئی نہادہ واد معنی یابی و تلاش مضمون تازہ داویم۔ غرضکہ از شعرائے متقدمین است .... الحال کہ در دورۂ ما زبان ریختہ بسیار بہ پاکیزگی و عمدگی رسیدہ مشار الیہ ہم مرتب سخن تازہ

---

[۱] میر حسن، تذکرہ شعرائے اردو، مرتبہ محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، دہلی، ۱۹۴۰، ص ۴۶

[۲] مرزا علی لطف، گلشن ہند، عبداللہ خاں حیدرآباد دکن ۱۹۰۶، ص ۱۰۳

گویان فہمیدہ دیوانِ قدیم خود را از طاق دل افگندہ دیوان جدید بزبان ریختہ گویان حال ترتیب دادہ "دیوان زادہ" نامش گزاشتہ ...... بنغمہ سنجان حال۔ در شیخ و شریف اورا استاد مسلم الثبوت میدانند بلکہ او خود اسامی کسانیکہ از اول تا آخر استفادہ شعر ازو گرفتہ اند...... میر تقی میر کہ شاعرے است جادو نگار اکثر اورا در مشاعرہ بطریقِ ظرافت واہ الشعرا می گفت"

موخر الذکر تذکرہ نگاروں کے خیالات سے صاف ظاہر ہے کہ حاتم بہ لحاظ اخلاق اور بہ اعتبار شاعری اپنے زمانے میں قابلِ احترام تھے۔ ان کا کلام مشہور و معروف تھا۔ بڑے بڑے شاعر ان سے استفادہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ خود مرزا رفیع سودا بھی ان کے شاگردوں میں داخل تھے۔ اور حاتم ان پر فخر کرتے تھے۔ ان کی طبیعت اور اخلاق خصائل کو بھی سب نے قابلِ تعریف کہا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ مصحفی[1] کا یہ جملہ کہ "میر تقی میر کہ شاعرے است جادو نگار اکثر اورا در مشاعرہ بطریقِ ظرافت واہ الشعرا می گفت" ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرالیتا ہے۔ یہی وہ جملہ ہے جو میر اور حاتم کے تعلقات پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔

حاتم بزرگ آدمی تھے۔ میر ان کے مقابلے میں نوعمر تھے۔ غالباً ان کو میر کی نکتہ چینی گراں گزرتی ہو گی اور اسی وجہ سے وہ ان سے بددل ہوں گے۔ میر بھی ان پر فقرے چست کرتے تھے۔ مشاعروں کے اندر ان کو "واہ الشعرا" کہہ کر پکارنا ان کی شان میں گستاخی سے کم نہ تھا۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے اختلاف بڑھا اور آخر میں میر "نکات الشعرا" میں بھی مذکورہ عبارت لکھنے سے باز نہ رہے۔ آگے چل کر میر حاتم کے ایک شعر پر اصلاح دیتے ہیں۔ اور ان کا مذاق اڑاتے

---

[1] مصحفی: تذکرہ ہندی، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۳۳، ص ۸۰، ۸۱

ہیں۔ شعر ہے۔

ہائے بے درد سے ملا کیوں تھا
آگے آیا مرے کیا میرا

میر فرماتے ہیں۔

"اگر شعر من می بود ایں چنیں می گفتم۔
مبتلا آتشک میں ہوں اب میں   آگے آیا مرے کیا میرا

اصلاح کے بعد فرماتے ہیں۔

"پیش گرمی ایں مصرع خنکی آں شعر روشن است"[1]

یہاں میر بہ حیثیت تذکرہ نگار نظر نہیں آتے بلکہ اپنے دشمن پر ہنستے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اس اصلاح کو محض میر کی ظرافت پر محمول نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس سے پہلے وہ حاتم کو کافی برا بھلا کہہ چکے ہیں۔ حاتم جیسے بزرگ کو بے کامل جاہل متمکن، دیر آشنا وغیرہ کہنا دشنام دہی سے کسی طرح کم نہیں۔۔۔ ان تمام باتوں کے نتیجے میں میر کے ساتھ حاتم کا جو رویہ تھا۔ وہ بھی میر ہی کی زبان میں ملاحظہ فرمایئے۔

"با من آشنائے بیگانہ است"

میر کی اسی غیر سنجیدگی اور بے اعتنائی کا شفیق نے بھی شکوہ کیا ہے۔

"دہر جائے کہ در احوال آشنا مصرع ثقیل یافتہ از طرف خود ختم کردم، و بجائے غیر مصرعے نوشتم و گفتم کہ ایں چنیں ہم مصرع خوب نماید، مارا اختیار پسند در قبضہ منصف است، خود چرا از ہیچ باید داد کہ من از بہتر یافتہ ام۔ آنانکہ،

---

[1] نکات الشعراء ص ،،

مبتذل اندر می پندارد" [1]

آگے چل کر میر کی ایک اور ستم ظریفی ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

"ایں انتخاب میر محمد تقی میر و شیخ علی خاں است:۔

دیکھ طور اس دور کا حاتم نے چھوڑی ہے شراب

یاد کر کر سبز رویاں کو وہ اب پیتا ہے بنگ

لفظ 'سبز رویاں' کہ دریں مصرع خلاف محاورہ افتادہ، در خاطر فاتر فقیر تغیر میرسد۔ (مصرع)

یاد کر کر خط کی سبزی کو وہ اب پیتا ہے بھنگ" [2]

میر نے اس شعر کو پہلی حالت میں لکھ کر یہ اعتراض کیا تھا۔

"در لفظ سبز رویاں تامل کردن ضرور است زیرا کہ آشنائے گوش ایں ہیچداں نیست" [3]

کہا نہیں جا سکتا کہ حاتم کے شعر کو غلط لکھ کر پھر اس پر اعتراض کیا گیا ہے اگر یہ میر کی شعوری کوشش ہوتی تو دوسرے لوگ اس پر ضرور اعتراض کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے میر کو یہ شعر اسی طرح سنایا ہو۔

بہر حال میر نے حاتم کے بارے میں جو اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ اس سے باہمی چشمک کا پتہ چل جاتا ہے۔ حاتم کے یہاں میر کی ہجو میں کوئی شعر نہیں ملتا۔ البتہ تذکروں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے پر آیا کرتے

---

[1] لچھمی نرائن شفیق، چمنستان شعرا، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۲۸، ص ۱۴۸

[2] چمنستان شعرا، ص ۱۴۴

[3] نکات الشعرا، ص ۸۷

تھے۔

حاتم نے ناجی کے متعلق کہا تھا

سخن میں فخر اپنا بن گئے رہتا نہیں ناجی
اسے سمجھائے حاتم کس طرح اشعار کہہ کہہ کر

مرزا علی لطف نے حاتم کے ایک معرکے کا بھی ذکر کیا ہے۔ چونکہ یہاں حاتم کی عادت کو سمجھنا ہے اس لیے اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں۔
" نعیم تخلص، نعیم اللہ نام، متوطن شاہ جہاں آباد معاصر محمد حاتم تخلص کا تھا۔ چنانچہ اکثر مشاعروں میں گفتگوئیں طنز وایما کی ان کے درمیان آتی ہیں۔ اور مکرر غزلیں انھوں نے باہم لڑائی ہیں۔ ایک دن محمد حاتم نے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی۔ اور مطلع میں غزل کے طنز محمد نعیم پر کی

جس دن سے کوئے یار کا حاتم مقیم ہے
ہر تر اسے خزاں سے بہلد نعیم ہے

جب بندہ پڑھنے کا محمد نعیم تک پہنچا تو انھوں نے بھی مطلع غزل یہ پڑھا

طلب نہ ہو تو سلیماں کی کچھ بھی خاتم ہے
لب سوال نہ ہووے تو ہیچ حاتم ہے " [۱]

لطف کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ حاتم میں بھی نوبدنو ہونے کی عادت تھی۔ مگر ان کا یہ رویہ، غالباً اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ ہی تھا۔ وہ نو عمروں کے ساتھ بے تکلف نہ تھے۔ ہو سکتا ہے اسی وجہ سے میر نے

---

[۱] گلشن ہند ۲۴۳ ص ۲۴۳

انھیں مغرور کہا ہو۔ اس کے علاوہ میر کا یہ کہنا کہ "با من آشنائے بیگانہ است" بھی ظاہر کرتا ہے کہ حاتم ان سے ہنسی مذاق کے تعلقات نہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میر بھی ان کی بزرگی سے منحرف ہو گئے اور ان پر فقرے چست کرنے لگے۔

بہر نوع میر کا، حاتم کے شعر پر خلاف تہذیب اصلاح دے کر خود ہنسنا اور دوسروں سے اس فعل کی داد چاہنا، ان کی سنجیدگی کو بدنام کرتا ہے۔۔۔ دوسرے حاتم کو جاہل اور متمکن کہہ کر دل کا بخار نکالنا بھی ان کی اصابت رائے کو مجروح کرتا ہے۔ مصحفی کے قول کے مطابق اگر وہ حاتم کو مشاعروں میں "واہ الشعراء" کہہ کر چھیڑتے تھے تو یہ امر بھی ان کے لیے قابلِ ملامت ہے۔

حجام، عنایت اللہ

عنایت اللہ، حجام عرف کلّو سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ قوم کے حجام تھے۔ اسی مناسبت سے تخلص بھی حجام کیا تھا شاہجہان آباد (دہلی) میں مدت سے اقامت پذیر تھے۔ اور اپنے آبائی پیشے سے ہی روزی کماتے تھے۔ مگر اس میں انھوں نے امتیاز قائم کر رکھا تھا۔ وہ اپنے ہم پیشہ لوگوں کی طرح نہ تو بازاروں میں پھرتے تھے، اور نہ دکان پر بیٹھتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت یادِ الٰہی میں گزرتا۔ ابتدا ہی سے موزوں طبع واقع ہوئے تھے۔ اس لیے باوجود کم علمی کے شعر خوب کہتے تھے۔ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ باریک بیں تھے۔ اور ندرتِ مضمون سے کلام کو جلا دیتے تھے۔ ان کے شعروں میں کیفیت ملتی ہے۔ اسی سبب سے مشاعروں میں انھیں خوب داد ملتی تھی۔ مزاج میں ظرافت تھی غزلوں کے مقطعوں میں اکثر اپنے پیشے کی رعایت سے مضمون باندھتے تھے۔ جو خوب بامزہ ہوتے۔ انھیں سودا کی شاگردی پر بہت ناز تھا۔ ان کے سوا کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس کے علاوہ مولوی فخرالدین سے جو چشتیہ سلسلے کے ایک بہت بڑے صوفی تھے انھیں بیعت حاصل تھی۔ اور اس پر فخر کرتے تھے۔ ان کا خط بھی وہ خود

ا؎ مصحفی تذکرہ ہندی مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد ۱۹۳۳ء ص ۷۷، ۷۸ سے حالاتِ زندگی سے اخذ کیے گئے۔

بناتے تھے اور خضاب لگاتے تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے ان سے خاص قربت حاصل کرلی تھی۔ منگل اور جمعہ کو ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اکثر محفل سماع میں ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ صوفیانہ لباس پہنتے تھے۔ اس لیے محلہ میں شاہ جی کے لقب سے مشہور تھے۔

میر حسن نے لکھا ہے کہ مدرسہ غازی الدین خاں کے قریب ان کی شعر و سخن کی محفل جما کرتی تھی۔[1]

مصحفی لکھتے ہیں کہ مجھ سے مدت سے ملاقات تھی اور بہت خلوص سے پیش آتے تھے۔

مختلف تذکرہ نگاروں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ عنایت اللہ حجام ظریفانہ طبیعت رکھتے تھے۔ اور ان کے مزاج میں شوخی اس قدر تھی کہ اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ چنانچہ ان کی غزلیں کے مقطعے اسی وجہ محفلوں میں مزا دے جاتے تھے۔ اور ان پر خوب واہ واہ ہوتی تھی۔ اول تو وہ خود قوم کے حجام تھے۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ تخلص بھی حجام تھا۔ اس لیے تخلص کی رعایت سے جب اپنے پیشے کی کوئی بات کہتے تو پوری محفل لوٹ پوٹ ہو جاتی۔

چند اشعار دیکھئے۔

اس شوخ کے کوچے میں نہ جایا کرو حجام
چھن جائیں گے اک دن کہیں ہتھیار تمہارے

رقیبوں پر میاں پڑتا ہے تب سو سو گھڑے پانی
بلا حجام کو جس روز تم حمام کرتے ہو

---

[1] میر حسن، تذکرہ شعرائے اردو، مرتبہ حبیب الرحمن خاں شیروانی۔ دہلی ۱۹۴۰۔ ص ۵۰

روز رخسار کے لیتا ہے مزے خوباں کے
بہتر اس سے کوئی حجام ہنر کیا ہوگا

٭٭٭

حجام تیرے دل کی تو آرزو بر آئے
چہرے پہ اوس کے خالق گر خط شتاب لایا

اس سے بڑھ کر ان کی شوخی کا اور کیا ثبوت ہوگا کہ اپنی زبان سے خود ہی کو "رجالا" (کم قوم) کہہ دیا۔ ان کا قطعہ ہے۔

حجام پڑا سخت حیا ناک کے پالے
کچھ اور تو کیا بات کہ وہ منھ سے نکالے
لگ چلتا ہوں اس شوخ سے رستہ میں تو مجھکو
جھنجھلا کے یہ کہتا ہے کہ چل دور رجالے[1]

اس موقع پر میر کا ذیل کا شعر بھی نقل کرنا لطف سے خالی نہیں ہے۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

حجام کو ایک طرف تو مشاعروں میں کافی مقبولیت حاصل تھی۔ اس کی وجہ ان کا ظریفانہ انداز بیان بھی تھا۔ اور اپنے پیشے کے مضامین کا اظہار بھی۔ دوسرے اس فن کے ایک بڑے استاد فن سودا سے انھیں تلمذ حاصل تھا، جو ان جیسے کم علم اور بے رتبہ لوگوں کے لیے بڑے فخر کی بات تھی۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے بہت بڑے متقی اور پرہیزگار صوفی محمد فخرالدین سے انھیں بیعت

---

[1] میر قدرت اللہ قاسم، مجموعۂ نغز، حصہ اول مرتبہ محمود شیرانی، لاہور، ۱۹۳۳، ص ۱۹۸

حاصل تھی جس سے ان کی سماجی حیثیت بھی بڑھ گئی تھی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے آپ کو بہت اونچا سمجھنے لگے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ پھر اپنے سامنے کسی کی کوئی حقیقت نہ سمجھی۔

میر قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے۔

"شاگرد رشید سرآمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا است۔ بنا برآنکہ منگ یک پہلو بود غیر از مرزا را شاعرے نمی دانست۔ تا بہ شگوے خود چہ رسد" [۱]

اس بیان سے ان کے زعم شاعری کا پتہ چلتا ہے۔ سودا کی شاگردی اور مشاعروں کی مقبولیت نے انھیں بے جا پندار میں مبتلا کر دیا تھا۔ جو ان کی بساط سے کہیں بڑھ کر تھا۔ وہ ایک معمولی درجے کے شاعر تھے۔

میر حسن نے لکھا ہے۔

"لیکن از یں شعر او معلوم شد کہ کلامش بے اصلاح است، در موشگافی معانی قصر دارد۔ شعر ایں ست"

کام کیا زور یہ حجام نے
شیخ کی داڑھی کو قصر کر گیا" [۲]

مصحفی نے لکھا ہے۔

"با وجود کم علمی شعر ہندی را بخوبی سرانجام می دہد" [۳]

اس طرح میر حسن کے قول کے مطابق ان کی شاعری بے اصلاح، تھی اور

---

[۱] میر قدرت اللہ قاسم، مجموعۂ نغز، حصہ اول، مرتبہ محمود شیرانی، لاہور ۱۹۳۳ء، ص ۱۶۸
[۲] تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۵۰
[۳] تذکرۂ ہندی، ص ،،

مصحفی کے نزدیک وہ کم علم تھے۔

میر نے "نکات الشعراء" میں حجام کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی مقبولیت کے پیش نظر انہیں یہ بات بری لگی ہو اس لیے میر کے مقابلے پر آگئے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اپنے استاد کی حمایت میں انھوں نے بلاوجہ عداوت مول لے لی ہو۔ جب کہ قائم اور مجذوب نے حق شاگردی ادا کیا تھا۔

میر کی مثنوی "اژدر نامہ" نے بھی معاصرین پر ناخوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ فضا میں اس کے شرارے ابھی موجود تھے۔ بہت سے شعرا اسی وجہ سے ان کے منہ پر آئے۔ اس لیے یہ بھی قرین قیاس ہے کہ اس رَو میں ان کی زبان سے بھی ہجویہ کلمات نکل گئے ہوں۔ خود بھی شوخ مزاج تھے ممکن ہے اسی شوخی نے انکی رگِ ظرافت پھڑکائی ہو۔ اس کے علاوہ میر کے کچھ شعر بھی ان کو گمراہ کر سکتے ہیں۔ میر نے بعض جگہ جہاں دوسرے پیشوں کے خوب رویوں کا اپنے کلام میں ذکر کیا ہے۔ وہاں نائی بچے کا بھی ذکر آگیا ہے۔ مگر یہاں یہ ذکر حدِ اعتدال سے کافی بڑھ گیا ہے۔

مل بیٹھے اس نائی کے سے کوئی گھڑی جو زاہد تو
جتنے بال ہیں سارے سر میں ویسے ہی اسکی حجامت ہو[1]

ممکن ہے اس قسم کے اشعار سے بھی حجام کی دلآزاری ہوئی ہو بہر حال حجام نے میر کو اشتعال دلایا۔ اگرچہ ہمارے سامنے حجام کا ایسا کلام موجود نہیں جس سے میر کی تضحیک کا علم ہو سکے۔ اور اس کی نوعیت کا جائزہ لیا جا سکے لیکن حجام کی مذمت میں میر کی مثنوی[2] "در مذمت آئینہ دار" موجود ہے۔ جو تریپن[3] اشعار پر مشتمل ہے۔

---

[1] میر تقی میر، کلیات میر، مرتبہ عبادت بریلوی، کراچی فردی ۱۹۵۸ء، ص ۱۰۴ تا ۱۰۴۲
باقی اگلے حاشیے پر

اس مثنوی میں میر نے حجام پر الزام لگایا ہے۔

کیا کہوں کیسے ہیں اوندھے یہ لچھ　　　کیجئے اصلاح عائد ہوئے شر

قاضی عبدالودود صاحب نے اس معرکہ کی وجہ مخاصمت بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔
" اس کا (عنایت اللہ حجام کا) قصور تو ظاہر ہے کہ وہ میر کی عظمت کا قائل نہ تھا ؎۵۳

اظہر راہی نے اسی مخاصمت کا سبب ان الفاظ میں بتایا ہے۔
" مثنوی میں میر نے ایک جگہ سودا سے برتری کا اظہار بھی کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کلو نے شاگردی کے ناتے کہیں سودا کو میر سے برتر کہہ دیا ہوگا" ؎۵۴

بہر حال اس خصومت کے اسباب کچھ بھی ہوں، میر کی لعن طعن اور فحش گوئی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حجام سے بہت زیادہ کبیدہ خاطر تھے۔ اس ہجو میں میر کی

گذشتہ سے پیوستہ

قاضی عبدالودود نے اس بات کی تائید کی ہے کہ یہ حجام کی ہجو ہے وہ کہتے ہیں :- بے شبہ عنایت اللہ حجام کی ہجو ہے۔ قاسم اس کے متعلق لکھتے ہیں۔ شاگرد مرشید سودا بنابر آنکہ سنگ یک پہلو بود غیر مرزا را شاعر نمیدانست، اس کا قصور تو ظاہر ہے کہ وہ میر کی عظمت کا قائل نہ تھا"، بحوالہ قاضی عبدالودود، عیار ستان، پٹنہ فام اکتوبر ۱۹۵۷ء حاشیہ ص ۱۴۷

اظہر راہی صاحب بھی اپنے مضمون " میر کی ہجویہ شاعری " میں اس کو حجام کی ہجو تسلیم کرتے ہیں۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کدورت اور رنجش کا غبار صاف نظر آتا ہے۔ اس کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں۔

موشگافوں کا نہیں ہے نام اب — مدعی شعر ہیں حجام اب
میر و مرزا میں حکم ہوئے خرد — نے کہ نائی جن پہ سب کا دست رد
سمجھے مرزا میر کو مرزا کو میر — نے وہ رگ زن جو نہ سمجھے شیر شیر
مجھ میں مرزا میں تفاوت ہے بہت — یاں حماقی واں عجالت ہے بہت
جس جگہ میں نے رکھی منہ میں زبان — ہوتے اس جاگہ جو مرزا بے گماں
استرے کانوں میں اپنے باندھ کر — کب کے اب تک گھس گئے ہوتے ادھر

قابل توجہ بات یہ ہے کہ میر نے حجام کے ساتھ ساتھ سودا کو بھی لے دے کی ہے۔ بظاہر اس میں سودا کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ حجام کو اصلاح دیتے تھے۔ مگر یہ ایسی بات نہ تھی کہ جو میر کو ناگوار گزرتی۔ ہمارے خیال میں میر کو یہ احساس تھا کہ سودا ہی حجام کو ترغیب دیتے ہیں اور وہ ان کو آگے رکھ کر خود ان کے خلاف آگ بھڑکاتے ہیں۔ اس در پردہ دشمنی کا میر کو دکھ تھا۔ اگر وہ اس معاملہ میں تنہا حجام کو قصوروار سمجھتے تو یہاں پر نہ سودا کا ذکر کرتے اور نہ اس ہجو کی ضرورت سمجھتے یا پھر اس میں اتنی شدت اختیار نہ کرتے۔ ذیل کے اشعار سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جاتی ہے۔

میر و مرزا میں حکم ہوئے خرد — نے کہ نائی جن پہ سب کا دست رد
سمجھے مرزا میر کو مرزا کو میر — نے وہ رگ زن جو نہ سمجھے شیر شیر

غرضکہ میر کو حجام کے ساتھ سودا سے بھی شکایت ہے۔ ایک کم قوم کو اپنا شاگرد بنانے کی اور اس سے اپنے ہم رتبہ شخص کا مقابلہ کروانے کی۔

قاضی عبدالودود صاحب کے الفاظ میں (میر) "خودداری کا جامہ اتار کر

بقیہ دوسرے صفحہ پر

ایک حجام کے مقابلے پر خم ٹھونک کر میدان میں آگئے۔" لیکن مذکورہ پس منظر یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر رہے ہیں کہ اس (حجام) کا قصور تو ظاہر ہے کہ وہ میر کی عظمت کا قائل نہ تھا، مگر اس کا کیا سبب ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ سودا کو بھی لے دے کی؟"

میر نے سودا سے نبٹنے کے بعد پھر نائی قوم کی حجامت بنائی ہے۔

آیا اک نائی زنانہ سا نظر	ہاتھ میں نلوا لئے بے پا و سر
میں کہا آتا ہے نلوا کام کیا	بولتا ہے آگے سے بدنام کیا
..... اس میں لوطیوں کی ڈالکر	مونڈتے ہیں..... اک اک بال کر

ان شعروں کی رکاکت تو ظاہر ہے۔ آگے چل کر بھی مخش الفاظ میں اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے۔ جن میں غم و غصے کی چنگاریاں دہکتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ اس ہجو میں میر نے نائیوں کا خاکہ اڑایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مزاح کا صحیح لطف پیدا نہ ہو سکا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ میر کی ذاتی رنجش کا غبار تھا۔ ان کے طنز کی آبیاری کو غم و غصہ کی تیزی بھی کند کر دیتی ہے۔ اور آخر میں سوائے لعن طعن اور پھکڑ پن کے کچھ باقی نہیں رہتا۔

(بقیہ ۱) مثنوی در مذمت آئینہ دار" کے بارے میں گمان غالب ہے کہ یہ عنایت اللہ عرف کلو حجام شاگرد سودا کی ہے" بحوالہ نثار احمد فاروقی۔ دلی کالج میگزین، میر نمبر ۱۹۶۲ء، دلی، ص ۱۹۱۔

۲ دلی کالج میگزین، میر نمبر، ص ۱۹۱

۳ عیارستان، ص ص ۱۴۷

حشمت، محمد علی

محمد علی نام تھا، حشمت تخلص کرتے تھے۔ محمد علی بیگ مقبول کے شاگردوں میں سے تھے۔ کشمیر کے رہنے والے تھے۔ اپنے زمانے کے مربوط گو شاعر تھے۔ اور مشکل پسند واقع ہوئے تھے۔ عبدالحیٔ تاباں کے استاد تھے قطب الدین خاں کے ہمراہ سہارنپور چلے گئے اور وہیں مارے گئے۔[2] لطف کے بیان کے مطابق یہ قطب الدین کے ہمراہ مرادآباد گئے تھے۔ وہیں پر محمد علی روہیلہ کے بیٹوں کے ساتھ جنگ چھڑ گئی اور یہ نہایت شجاعت و دلیری کے ساتھ جنگ میں کام آئے۔ اپنے آپ کو عورتوں کی طرح آراستہ رکھتے تھے۔ لیکن مردانہ اوصاف سے بھی متصف تھے، نظم ریختہ میں سلیقہ رکھتے تھے۔

میر تقی میر نکات الشعراء میں ان سے کافی برہم نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ان کے خلاف انتہائی سخت اور نازیبا الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

" از شاگردان غنی بیگ قبول است۔ اکثر بہ شعرا مردان اعتراضات بیجا می کرد، و جواب باصواب می یافت۔ در شعر ریختہ کہ بسیار پاجیانہ میگفت، گہہا دارد۔ حاصل، عجب ہنگامہ پردازے بود۔ دریں ایام ہجو اوے، ہم بہم نمی رسد "[3]

---

[1] تذکرۂ شعرائے اردو ص ۴۸ سے حالات زندگی لئے گئے

[2] گلشن ہند، ص ۱۰۴ سے حالات زندگی لئے گئے۔

[3] نکات الشعراء، ص ۱۰۷

مذکورہ عبارت سے ان کے اختلافات پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے۔ حشمت ان کے اشعار پر اعتراضات کیا کرتے تھے۔ جو میر جیسے بڑے شاعر کے لئے توہین کی بات تھی۔ اگرچہ میر ان اعتراضات کا جواب بہم پہنچا دیتے تھے مگر طرفین میں اس نوک جھونک سے نزاع پیدا ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میر ان کو "عجب ہنگامہ پرداز" کہتے ہیں۔ اور اس کی شاعری کو "بسیار پا جیانہ" کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ حالانکہ میر حسن حشمت کو شاعر مربوط گو کہتے ہیں۔ اور ان کی وقعت پسندی کا ذکر کرتے ہیں۔ اس طرح لطف بھی ان کے سلیقۂ نظم ریختہ کی تعریف کرتے ہیں۔ قائم نے تو ان کی چار دانگ شہرت کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"محمد علی حشمت تخلص از مردم کشمیر بود، حیا و حمیت و آدمیت خلاف کلیہ وطن داشت سابق بریں دو سال بر فتت قطب الدین علی خاں سخاوت و شجاعت و ے در اطراف و اکناف عالم شہرت عظیم دارد۔"[1]

ان حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر نے تعصب سے کام لیا ہے۔ بعد کے تذکرہ نگاروں پر اس کا خاطر خواہ ردعمل ہوا۔ چنانچہ فتح علی گردیزی نے اپنے تذکرے "ریختہ گویان" میں میر کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو انھوں نے حشمت کے ساتھ کیا تھا۔

"تذکرہ ریختہ گویان کے مقدمے میں ڈاکٹر عبدالحق نے اس سلسلے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

"حشمت کی نسبت لکھا ہے۔ (یعنی گردیزی نے)

"دیوانش فقیر سیر کردہ و چشمے آب دادہ، حقا کہ دراں تلاش معنی تازہ کردہ

---

[1] قائم، مخزن نکات، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ص ۲۶

والفاظ رنگینی بروئے کار آوردہ"

میر صاحب کی نسبت فرماتے ہیں۔

"فقیر سیر اشعارش نمودہ دچشمے آب دادہ، حقاکہ دراں تلاش معنی بیگانہ کردہ است و حرف آشنا را بروئے کار آوردہ"

کہاں حشمت کہاں میر صاحب؟ اور یہ روکھی پھیکی تعریف بھی جس بے دلی سے کی ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ خصوصاً جب ہم اس کا مقابلہ دوسرے معمولی شاعروں کے ذکر سے کرتے ہیں۔ جو گردیزی نے اپنی کتاب میں کئے ہیں تو اور بھی حیرت ہوتی ہے۔ لیکن سب سے بڑی ستم ظریفی یہ کی ہے کہ حالات کے بعد میر صاحب کے کلام میں سے صرف ایک شعر نقل کیا ہے۔ اور وہ بھی بہت ہی معمولی۔ حالانکہ معمولی سے معمولی اور گمنام شاعروں کے کلام سے بھی رجب مل گیا ہے تو صفحے دو صفحے ضرور نقل کر دیتے ہیں۔" [۱]

اس کی وجہ بھی مولوی عبدالحق کی ہی زبان سے سنئے۔

"بعض اور صحاب کی طرح گردیزی کو بھی یہ بات ناگوار گزری کہ اس کے بعض دوستوں پر میر صاحب نے بے باکی سے نکتہ چینی کی یا ان کی طرف سے بے التفاتی کی۔ لہٰذا حق دوستی ادا کرنے کے لیے اس نے خود ایک تذکرہ لکھا۔ جسے افسوس ہے کہ فروغ نہ ہوا" [۲]

خود میر نے حشمت کے شاگرد عبدالحیٔ تاباں کی نکات الشعراء میں

---

۱ فتح علی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویاں، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد ۱۹۳۳ء ص ۱۳

۲ ایضاً

۳ میر نے تاباں کے لئے لکھا ہے۔ باقی دوسرے حاشیے پر

کافی تعریف کی ہے۔ تعجب ہے کہ انھوں نے شاگرد کے مقابلے میں بھی استاد کی شاعری کو نہ رکھا۔ بلکہ اسے 'بسیار پاچیانہ' کہا

حشمت کے کلام میں ہمیں کوئی ایسا شعر نہیں ملا جس سے میر کے بارے میں کسی امر کا اظہار کیا گیا ہو۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حشمت صرف میر کی شاعری پر اعتراض کرتے تھے اور اس سے کبھی آگے نہ بڑھے مگر میر اس چھیڑ چھاڑ کو تنازعہ سمجھ کر ذاتی سطح پر اُتر آئے۔

گزشتہ سے پیوستہ

" زبان رنگینش پاکیزہ تر از برگ گل۔ گلستان سخن را نازک دماغ بلبل۔ سمندر رنگینی فکرش با گلگوں بادِ بہار طابق النعل بالنعل است، ہر چند عرصۂ سخن او ہمیں در لفظہائے گل و بلبل تمام است، اما بسیار رنگیں می گفت۔ از دیدن رنگ آتشش بے اختیار از ذہن من گل گمانش سر میزد، نسبت بہ شعر او استاد او را رتبہ شاگردی او نبود"۔ بحوالہ نکات الشعراء، ص ۱۰۸

خاکسار، محمد یار

محمد یار نام تھا خاکسار تخلص کرتے تھے۔ شاہ جہاں آبادی قدم شریف کے خادموں میں سے تھے۔ یہ ریختہ کے بہت مشاق شاعر تھے۔ اور صاحب دیوان تھے۔ ان کے اشعار سے ان کی خوش بیانی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔[1]

خاکسار اور میر تقی میر کے باہمی تعلقات کافی خراب تھے۔ میر نے اپنے تذکرے 'نکات الشعرا' میں اس کے لیے خاکسار کو قصور وار ٹھہرایا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"آتش کینہ کہ بے سبب افروختہ است، چوں کباہم بو میدہد"۔[2] دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی خاکسار کے متعلق یہی لکھا ہے مرزا علی لطف کے الفاظ یہ ہیں۔

"ہمیشہ محمد تقی میر تخلص سے نوک جھونک کرتا رہا۔ اور انکے اشعار میں مشاعروں کے اندر اکثر تصرف کیا گیا ہے"۔[3]

اگرچہ ہمیں کسی تذکرے سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ خاکسار کو میر سے یہ عداوت کیوں

---

[1] گلشن ہند ص، ۱۲۴ سے حالات زندگی لیے گئے۔

[2] نکات الشعرا، ص ۱۱۴

[3] گلشن ہند، ص ۱۲۴

تھی؟۔ پھر بھی کچھ تذکرہ نگاروں کے بیانات اس سلسلے میں کافی اہم ہیں۔

تذکرہ کریم الدین میں لکھا ہے۔

"شیخ محمد یار خاکسار یہ ایک درویش "نمدہ ریختا قدم شریف دہلی میں خدمت کیا کرتا تھا۔ شعرا متقدمین میں شمار کیا گیا ہے۔ سودا میر حسن سے پیشتر تھا۔ میر تقی میر لڑکپن میں جب شعر کہتا تھا، خاکسار اس کو اصلاح دیا کرتا تھا۔ لیکن میر اپنے تذکرے میں یہ ذکر نہیں کرتا بلکہ وہ خاکسار کو بسبب غرور اور سرکشی کے ملزم کرتا ہے۔ خاکسار چونکہ ملقب بہ لقب "شاہ الشعرا" تھا، اس دعوے کو میر نہیں مانتا"[52]

اس عبارت میں تین باتیں غور طلب ہیں۔

۱۔ خاکسار اس کو بچپن میں اصلاح دیا کرتا تھا۔

۲۔ میر اپنے تذکرے میں یہ ذکر نہیں کرتا بلکہ وہ خاکسار کو بسبب غرور اور سرکشی ملزم کرتا ہے۔

۳۔ خاکسار چونکہ ملقب بہ لقب 'شاہ الشعرا' تھا اس دعوے کو میر نہیں مانتا۔

نکات الشعرا سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی کہ میر کو خاکسار سے تلمذ تھا۔ پھر بھی اس بات کو یہ سمجھ کر رد نہیں کیا جا سکتا کہ میر اس کی تائید نہیں کرتے۔ انھوں نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر بہت سے حقائق سے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کی ہے۔ خان آرزو کے متعلق بھی وہ 'ذکر میر' میں اس بات کا اقرار

لہ نکات الشعرا کا جو نسخہ ہمارے پاس ہے، اس میں بجائے "شاہ الشعرا" کے "سید الشعرا" ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہو۔

۵۲ تذکرہ کریم الدین، ص ۸۹، بحوالہ خواجہ احمد فاروقی "میر تقی میر حیات اور شاعری"، ص ۲۴۳

نہیں کرتے کہ خان آرزو نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی حصہ لیا تھا۔ اس کے برخلاف میر جعفر اور سعادت خاں سعادت کے فیضان اور ترغیب کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر دوسرے تذکروں سے ہمیں خان آرزو کے تلمذ کی شہادتیں نہ ملتیں تو اس حقیقت کا منکشف ہونا بہت مشکل تھا۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے خاکسار سے ابتدائی زمانے میں اصلاح لی ہو۔ مگر بعد میں جب خود انھیں شہرت حاصل ہو گئی تو خاکسار کا ذکر مناسب نہ سمجھا۔ خود خاکسار بھی کوئی بڑے شاعر نہ تھے جس سے نسبت شاگردی کا ظاہر کر کے میر کوئی امتیاز حاصل کر سکتے۔ دوسری بات ان کے غرور و سرکشی کے متعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ میر جیسا بڑا شاعر خاکسار جیسے معمولی شاعر کو کیوں کر خاطر میں لاتا۔ تیسری بات خاکسار کے "شاہ الشعراء" ہونے کی ہے۔ اگر خاکسار کو واقعی یہ خطاب ملا ہوتا تو دوسرے تذکرہ نگار میر کے اس بیان کی تردید کر سکتے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ خاکسار کے دوست انھیں اس لقب سے یاد کرتے ہوں۔ جس کو میر نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ بلکہ انھوں نے اس لقب کی آڑ لے کر الٹا خاکسار کو ہی مورد الزام ٹھہرایا۔ یہ بات ان کو برافروختہ کرنے کے لئے کچھ کم نہ تھی۔

مصحفی جو میر سے واقف تھے۔ اور بقول ان کے وہ ان پر کافی مہربانی فرماتے تھے اپنے تذکرے میں ایک نیا انکشاف کرتے ہیں۔ انھوں نے خاکسار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"گویند کہ میر تقی میر در عالم شباب منظور نظر او بودہ" [۱]

مصحفی نے خود اس واقعہ کی نہ کوئی تفصیل لکھی اور نہ کوئی حوالہ ہی دیا

---

۱ تذکرہ ہندی، ص ۸۸

البتہ عمدۂ منتخبہ کے مصنف نے خاکسار کے متعلق اس امر کا اظہار ضرور کیا ہے۔

"می گویند کہ میر تقی میر در عالم شباب خیال امرد پرستی در سر داشت دہر طفلے کہ مد نظر او بود کار بار دنیائی داشت"۔ [1]

مصحفی کا یہ انکشاف جہاں میر کے سلسلے میں دل چسپی کا باعث ہو سکتا ہے وہاں خاکسار اور میر کے تعلقات کو سمجھنے میں بھی ہماری کافی مدد کرتا ہے۔ خاکسار اول تو بزرگ تھے۔ دوسرے میر بچپن میں ان سے اصلاح لے چکے تھے، اور اس کے علاوہ ان کے منظور نظر بھی تھے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر وہ میر سے توقع رکھتے تھے کہ وہ ان کا ہی دم بھریں۔ لیکن میر ان کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ نہ انھوں نے ان کے سامنے اپنی سعادت مندی کا اظہار کیا۔ اور نہ ان کی شاعری کے قائل ہوئے۔ اسی بات پر خاکسار ان سے برہم تھے۔ آخر میں یہ برہمی کشیدگی میں تبدیل ہو گئی۔ پھر بغض و عناد نے دلوں میں جڑ پکڑ لی۔

خاکسار کا میر سے نوک جھونک کرنا اور موقع پڑنے پر ان کی ہجو کرنا اسی صورت حال کا نتیجہ ہے۔ قائم نے 'مخزن نکات' میں خاکسار اور سودا کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خاکسار کو میر کی طرف سے کافی تلخی تھی۔

"ایک دن خاکسار اور سودا مرتضیٰ قلی کے یہاں موجود تھے۔ چونکہ میر اور خاکسار کے تعلقات بہت خراب تھے۔ اس لئے خاکسار نے بے موقعہ میر کا شکوہ و شکایت شروع کر دیا۔ اور حاضرین مجلس سے بھی اصرار کیا کہ وہ میر تقی میر کی ہجو کہیں اگرچہ لوگوں کو ان کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ پھر بھی سودا نے انکا دل رکھنے کے لئے"

---

[1] میر محمد خاں، عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرہ سرور، مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، دہلی یونیورسٹی، ص ۲۴۳

یہ مطلع کہہ کر ان کے حوالے کر دیا۔

میر کا ٹکھڑا ہے بے نہتا گل زنبق سا ہے
پیٹ بھی اس کا جو میں دیکھا سو کچھ جھنبن سلا ہے

مطلع کو سن کر سب لوگ ہنس پڑے۔ خاکسار بھی محفوظ ہوئے۔ لیکن جب اس بات کو اچھا خاصا وقت گزر گیا اور لوگ برابر ہنستے رہے تو انھیں کچھ احساس ہوا۔ دفعتاً ان کی نگاہ اپنے پیٹ پر پڑی اور سارا معاملہ سمجھ گئے۔ اس پر خاکسار بہت بگڑے اور ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس دن سے سودا اور خاکسار کی ملاقات ترک ہو گئی"۔ لہ

قائم نے بھی انکے متعلق میر سے ملتی جلتی رائے کا اظہار کیا ہے۔

"در حقیقت متمکن و باعتقاد خود ظریف ہر چند حسن با آشنا و غیر آشنا بر سر رشتہ مزاح می آرد۔ لیکن ہمکش تاب شنیدن جواب ندارد، بنا بریں از تمام عالم شاکی است" لہ۔ اس کے بعد وہ مذکورہ بالا واقعہ بیان کر دیتے ہیں۔

خشقی نے بھی ان کی بات کو دہرایا ہے۔

"ظاہرا تذکرہ نوشتہ و خود را مخاطب بخطاب سید الشعرا ساختہ۔ احوال خود اول ثبت نمودہ"۔ سہ

ان بیانات کے برعکس میر حسن نے خاکسار کی حمایت کی ہے اور ان کی تردید کی ہے کہ وہ نہ تو متمکن تھے اور نہ دوسروں سے کھنچتے تھے۔ لکھتے ہیں

لہ سہ قائم مخزن نکات، مرتبہ عبدالحق اورنگ آباد، ص ۸۸

سہ کلیم الدین، دو تذکرے، ص ۱۴۱

"آنچہ میر تقی در تذکرہ خود نوشتہ است کہ خود را بسیار می کشند غالب کہ ایں حرف راست نہ باشد، ور تقصیر اگر در گشید بہ نزد ایں فقیر بجا ست شخصے کہ خادم چنیں مکان مقدس باشد اگر دماغ بر فلک رساند رواست، دیگر دلیل بر بطلان ایں با ایں کہ اگر ہم چنیں بود خاکسار تخلص نہ می نمود مگر در مزاج متانتے خواہد بود

خاکسار اسکی تو آنکھوں کے کہے مت لگیو   مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

میر تقی میر گوید کہ اگر بجائے ' بیمار کیا ' گرفتار کیا ' می شد بہتر می بود۔ لیکن در عقل فقیر چنیں می گزرد کہ اگر چشم خود می بود گرفتار مناسب بود۔ چوں ایں جا چشم معشوق است بیماری صحت دارد"۔[1]

خاکسار چونکہ قدم شریف کے خادم تھے، اس لئے میر حسن نے بطور عقیدت ان کی طرف داری کی ہے۔ ورنہ دوسرے تذکروں سے ان کے بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ خاکسار اور میر کی رنجش اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس کا اندازہ میر کی تحریر سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

میر لکھتے ہیں۔

"شعر ریختہ می گوید۔ خود را دو بیکشد، و بسیار سفلگی می کند، بلکہ از ننگ آں بنائے ریختہ را بآب رسانیدہ۔ چنانچہ علی الرغم ایں تذکرہ نوشتہ است، بنام "معشوق چہل سالہ خود" احوال خود را اول از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سید الشعراء پیش خود قرار دادہ۔ آتش کینہ کہ بے سبب افروختہ است، چوں کباب، بومیدہ انخصم پیچ من، ریسجان می تابد، کہ گوئی پسر رسن تاب است۔ محمد معشوق گنبوہ کہ مردے است تائب میر بحر بسیار گر مجوش، زیادہ باش چوں شنید کہ خاکسار کاوہم نام دارد بداہتہ گفتہ، مصرع:۔

کتا ہے دربار کا کلو اس کا نام

---

[1] تذکرۂ شعرائے اردو، ص

چوں کلّا اکثر نام سگہا میگزارند لطف بہم رسانید. ہر کہ دم لابہ او دیدہ است می داند. فخر او ہمہ بر ریختہ است طرفہ ایں کہ آں ہم نام ہا لوط و خود لوہم نادرست. تقلید مرزا جان جاناں مظہر در ہر امر میکند. اگر کسے تکلیف شعر کند گویدکہ وقتے بجا بودم. آہ آہ من ایں رنگ داشت. سبحان اللہ مردماں ایں را شعر می نامد. بابا! من شعر نمی گویم وہا ایں برادراں یوسف کہ با شاعران باشیم برپطے.... الغرض بسیار کم فرصت و بے تہ است. ایں چند شعر کہ بنام او نوشتہ می آید، از فیض سخن است، از منیست" [1]

آخری جملے سے خاکسار کے کینے کے بجائے خود میر کے کینے کا پتہ چل جاتا ہے. یہاں جوش عداوت میں وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ یہ شاعروں کا تذکرہ ہے. انھیں سنجیدگی سے کام لینا ہے. پھر خاکسار کو نادرست اور بے تہ کہنا اور اس کی شعر... کا ذکر کرنا بھی میر کی انتہائی نفرت اور کدورت کو ظاہر کرتا ہے. اس کے علاوہ خاکسار کی توہین میں محمد معشوق کنبوہ کے ایک غیر شائستہ فقرے کی داد دینا بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ان کی عداوت اور ذاتی رنجش کا غبار ہے.

تذکرۂ ریختہ گویان کے مصنف گردیزی نے میر کی اس ناانصافی کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے. لکھتے ہیں.

"گویند بسیار بر می پیچد خود را در زمرۂ شعرائے مسلم محسوب می کند. بہرحال شعرش از موزونیت خالی نیست و آں کہ بعض اعزہ سرِ بانکار موزونیت او برآوردہ اورا از زمرہ شعرا خارج می کنند. ناشی از ستم ظریفی و بے انصافی است و شعرش نسبت شعرائے مسلم بدرجہ نازل البتہ است لیکن انکار موزونیت بچہ راہ" [2]

---

[1] نکات الشعرا، ص ۱۱۴. [2] فتح علی گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویاں مرتبہ عبدالحق، ص ۵۲

اس مختصر بحث سے اتنا تو ظاہر ہو گیا کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے انتہائی کبیدہ خاطر اور دل برداشتہ تھے۔ اور دونوں نے ہر طرح سے اپنے دل کا غبار نکالا ہے۔ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ میر کے کلیات میں خاکسار کی ہجو میں کوئی شعر نہیں ملتا۔ جب کہ انھوں نے اپنے تذکرے میں خاکسار کے خلاف خوب زہر اگلا ہے۔ خاکسار کا کلام چونکہ دستیاب نہیں ہوا اس لیے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ان کا ہجویہ کلام ضائع ہو گیا ہوگا۔ مگر میر کا کلام تو ہمارے سامنے موجود ہے۔ پھر ایسا کیوں ہے۔ ہمارے خیال میں یہ میر کی عداوت کی انتہا ہے کہ ان کی ناگواری اشعار کا تاب اعتبار نہ کر سکی اور انھیں اس کے لیے نثر کا سہارا لینا پڑا۔

سودا، مرزا محمد رفیع

مرزا محمد رفیع[1] نام اور سودا تخلص تھا۔ مرزا محمد رفیع تاجر کے بیٹے تھے۔ ۱۱۱۸ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد جو کچھ ترکہ حصہ میں ملا دوستوں میں ختم کر دیا۔ اور مصاحب ہو گئے۔ ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مروجہ علوم خاص طور پر فارسی سے بخوبی واقف تھے۔ پہلے فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ بعد میں خان آرزو کے مشورے پر ریختہ گوئی کا آغاز کیا۔ ہندوستان کے تمام شاعروں نے اپنے قاعدے کے مطابق انھیں ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا۔ سودا کثیر الاحباب تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ خان آرزو، خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ چونکہ ظریف طبع اور شوخ مزاج تھے۔ اس لیے ہر محفل میں مقبول ہوتے۔ اپنے کمالِ فن کی وجہ سے انھیں غیر معمولی شہرت حاصل تھی۔ سودا علم موسیقی سے بھی آگاہ تھے۔ کتے پالنے کا بھی شوق تھا۔ بلکہ یہ شوق آخری عمر تک برقرار رہا۔ دہلی کے حالات خراب ہونے پر ۱۱۸۵ھ میں فرخ آباد پہنچ گئے۔ اور وہاں مہربان خان رند کی سرکار سے منسلک رہے۔ آخر میں فرخ آباد کے حالات بھی بگڑ گئے۔ اور انھیں مجبوراً فیض آباد جانا

---

[1] سودا کے حالات زندگی، مرزا محمد رفیع سودا، خلیق انجم، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۶۵ تا ۱۳۳ سے لیے گئے۔

پڑا۔ یہ اودھ کا دارالخلافہ تھا۔ نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں معقول تنخواہ پہ ملازم ہو گئے۔ شجاع الدولہ کے فرمان پر آصف الدولہ کی سرکار سے منسلک رہے۔ آصف الدولہ نے فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ آباد کیا۔ تو یہ بھی ان کے ساتھ لکھنؤ آ گئے۔ آصف الدولہ کی سرکار سے انھیں چھ ہزار روپے سالانہ کی جاگیر مقرر ہو گئی تھی نواب شجاع الدولہ نے دو سو روپے ماہوار سودا کے مقرر کئے تھے۔ اور خلعت عطا کی تھی۔ آصف الدولہ کی سرکار سے بھی یہی ماہانہ ملتا رہا۔

معلوم ہوتا ہے کہ آصف الدولہ کے عہد میں ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی انھیں اپنی تنخواہ حاصل کرنے کے لئے ان کے ملازمین کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ ۱۱۹۵ھ میں سودا کا انتقال ہو گیا۔ اور انھیں امام باڑہ امام باقر میں دفن کیا گیا۔ سودا اپنے زمانے کے مشہور اور قادر الکلام شاعر تھے۔ میر بھی ان کے فن کا اعتراف کرتے تھے۔ چنانچہ نکات الشعراء میں ان کی کافی تعریف و توصیف کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"سودا تخلص کرتے ہیں۔ خوش خلق، خوش گو، گرم جوش، یار باش شگفتہ رو جوان ہیں۔ شاہ جہاں آباد وطن ہے۔ اور نوکر پیشہ ہیں غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ، مخمس و رباعی سب خوب کہتے ہیں۔ سرآمد شعرائے ہندی ہیں۔ نہایت خوش گو ہیں۔ ..... چنانچہ ریختہ کی ملک الشعرائی انھیں زیب دیتی ہے۔"[1]

اس کے بعد انھوں نے سودا کے قصیدے "تضحیک روزگار" کی تعریف کی ہے۔ اور اس کا مطلع بھی نقل کیا ہے۔

---

[1] میر تقی میر، نکات الشعراء، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، ص ۱۳۱

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بیک قرار

پھر اس بات کو بھی قابل ذکر سمجھتے ہیں کہ "اکثر ساتھ ساتھ غزل کہنے کا بھی اتفاق ہوتا ہے" اشغال کی صورت میں بھی ان کی فنی عظمت کی تائید کرتے ہیں۔ اور اپنا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔

ایک ذرہ ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور
اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور

غزل کے ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی
گیا ہو میر دیوانہ رہا سودا سو مستانہ

ایک غزل کے ایک قطعے میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

کیا رہا ہے مشاعرہ میں اب
لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں
میر و مرزا رفیع و خواجہ میر
کتنے یہ اک جوان ہوتے ہیں!

سودا بھی ان کی استادی کے قائل ہیں۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے کمال فن کے معترف تھے اور آپس میں خلوص برتتے تھے۔ لیکن زمانہ کی رفتار ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ ابتدا میں تو یہ باہمی یگانگت قائم رہی۔ مگر بعد میں دونوں کے دلوں میں فرق پیدا

ہوگیا تھا۔ دونوں کے کلام میں ایک دوسرے کے خلاف شعر ملتے ہیں جن میں ایک دوسرے پر چوٹیں ہوئی ہیں۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ پہل کس کی طرف سے ہوئی مگر بعض وجوہات کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ابتدا میر کی طرف سے ہوئی ہوگی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔

"دونوں نے ایک دوسرے کی باقاعدہ ہجویں بھی کہیں اور اس کی ابتدا غالباً میر کی ہی طرف سے ہوئی۔ سودا کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔ میر کو یہ بات بہت ناگوار تھی انھوں نے سینتس اشعار کی ایک ہجو کہی جس میں سودا کو بہت برا بھلا کہا۔" دوسرے میر نے نکات الشعرا میں بتایا ہے کہ دونوں اکثر ساتھ ساتھ غزلیں کہنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ یعنی مشاعروں میں ایک ہی طرح میں غزلیں سناتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ میر کے غرور کمال کی وجہ سے ان کے مقطع میں بھی سخن گسترانہ بات آپڑی ہو۔ یا پھر سودا کے مقابلے میں اپنی کوئی غزل فخریہ انداز میں سنائی ہو اور یہ انھیں برا لگا ہو۔ سودا کے بعض اشعار سے بھی ہمارے خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔

کہتے ہیں وہ جو ہے سودا کا قصیدہ ہی خوب
ان کی خدمت میں لئے میں یہ غزل جاؤنگا

سودا کو تم سمجھتے تھے کہہ نہ سکے گا یہ غزل
آفریں اپنے وہم پر صدقے میں اس گمان کے

سودا کے بارے میں میر کے علاوہ اور کس کو یہ جرأت تھی کہ ایسا گمان کرے یا پھر وہ میر کے سوا اور کسی شاعر کو یہ بات جتانے کی ضرورت محسوس کرتے۔

لہ مرزا محمد رفیع سودا، ص ۲۹۵

بہرحال سوداؔ علم مجلسی کے ماہر تھے۔ اس زمانے میں ہم رتبہ، برابر والوں سے الجھنا خلاف آداب تھا۔ ویسے بھی میرؔ ان کو اپنا شریک فن سمجھتے تھے اور ان کی شعرگوئی کے قائل تھے۔ اس لئے سوداؔ نے حتی المقدور میرؔ کی ہجو سے خود کو باز رکھنے کی کوشش کی مگر آپس میں معاصرانہ چھیڑ چھاڑ شروع ہو چکی تھی۔ پہلے تو سوداؔ کا میرؔ کے بارے میں یہ انداز تھا۔

سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے اوستاد کی طرف

پھر اندازِ گفتگو کے یہ تیور ہو گئے۔

نہ پڑھیو یہ غزل سوداؔ تو ہرگز میرؔ کے آگے
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

میرؔ بھی اس کا جواب دیتے ہیں۔

طرف ہونا مرا مشکل ہے میرؔ اس شعر کے فن میں
یونہی سوداؔ کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

(۵) [illegible]

اب مشاعروں کے اندر ان میں معرکہ آرائیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اگرچہ اس میں تو تو میں میں والی بات نہ تھی مگر پھر بھی بعض اشعار کے تیور بتا دیتے تھے کہ دونوں میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ ایک دوسرے پر چھا جانے کی خواہش میں دونوں نے اپنے اپنے کمال کے خوب جوہر دکھائے۔ اسی کشمکش میں دونوں طرف سے فخریہ اشعار بھی ہو جایا کرتے تھے۔

میرؔ

اس فن کے پہلوانوں سے کشتی رہی ہے میرؔ
بہتوں کو ہم نے زیر کیا ہے پچھاڑ کر

سودا
پوچھنا اشعار کا سودا کے کیا ہے شاعرو
گفتگو میں اس کی پاتا ہوں نظیری کا دماغ

سودا
شاعران ہند کا تو گرچہ پیغمبر نہیں
پر سخن کہنے میں اے سودا تجھے اعجاز ہے

ہم طرح غزلوں میں دونوں استادوں نے اپنے گوہر اشعار کی چمک سے محفلوں کو چکا چوند کر دیا تھا۔ اس منظر کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

سودا
برابری کا تری گل نے جب خیال کیا
صبا نے مار تھپیڑے منہ اس کا لال کیا

میر
چمن میں گل نے جو کل دعوی جمال کیا
جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

سودا
نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک کو دیکھو تو کچھ رہا بھی ہے

میر
ترا ہے وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں
نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہے

سودا
جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

میر
اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے
پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کرو گے

سودا
تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

میرؔ
مدعی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں
چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں

ان اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف ایک ہی قافیہ کو نئے نئے انداز سے باندھنے کی کوشش کی۔ بلکہ ایک ہی مضمون کو اپنے اپنے طور پر مقابلے بازی کے انداز میں کہا اس صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسے موقعوں پر میرؔ و سوداؔ کے مضمون لڑ گئے ہیں بلکہ یہ ان کی شعوری کوشش تھی۔

میرؔ اور سوداؔ کے معرکوں میں بعد کو جو گرمی پیدا ہوتی اس میں بڑی حد تک میرؔ کی غلط فہمیوں کو دخل تھا۔ سوداؔ اپنی خوش خلقی اور ملنساری کی وجہ سے کثیر الاحباب تھے۔ شاگردوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ اس زمانے میں بہت سے ایسے شاعر جو میرؔ پر کیچڑ اچھال رہے تھے، سوداؔ کے دوست بھی تھے اور شاگرد بھی۔ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ سوداؔ نے انھیں کوئی ترغیب دی ہوگی یا میرؔ کے خلاف اکسایا ہوگا۔ مگر میرؔ کو یہ احساس ضرور تھا کہ سوداؔ ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں، اور ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں۔ مگر میرؔ کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا اس لیے انھوں نے کھل کر تو کچھ نہ کہا۔ البتہ سوداؔ سے اس بات کا شکوہ ضرور کیا کہ وہ کم قوم لوگوں کو اپنا شاگرد بنا لیتے ہیں۔ جبکہ یہ لوگ اس فن شریف کے قطعاً اہل نہیں۔

مثنوی "تنبیہہ الجہال" میں انھوں نے یہ شکایت بڑے دکھ کے ساتھ کی ہے۔

ہم تلک بھی تھی وہی رسم قدیم
یعنی جن کے ہوتے تھے ذہن سلیم

پیار کرتے تھے انھیں استادِ فن!
ان کے ہوتے رہبرِ راہِ سخن!
جلف داں زنہار پاتے تھے نہ بار
شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار
نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا
شعر سے بزازوں نداغوں کو کیا
الغرض یاروں نے نئیں فتنہ یں اٹھا
جو کوئی آیا اسے دی پاس جا

یاروں کو یہ شکایت سنا کر پھر انجام سے بھی باخبر کیا ہے کہ کم قوم ہمیشہ اپنے استادوں کے منھ آتے ہیں

وہ سراپا جہل ناگہ وقتِ کار
ہم سے تم سے کرنے لاگا اعتدار
سر میں رکھ کر دعوئ طبع لطیف
میر و مرزا کا ہوا آخر حریف

شاید اس نصیحت کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ بلکہ سودا کے شاگرد میر کے خلاف ہی کہنے لگے۔ قائمؔ نے ان کی سیادت[1] کا مذاق اڑایا۔ مجذوب نے اپنے اہل ہنر اور خلف سودا[2] ہونے کی دھمکی دی۔ محمد امان نثار نے جو حاتم کے شاگردوں کے ناطے[3] سودا کے قریب تھے بھری محفل میں ان کی تحقیر کی۔ ان سب باتوں سے

۱۔ سیدی کے لئے کہا ہے تم میر جی میر — کہیئے تو بجا ہے آپ کو میر خمیر

۲۔ لے میر مت سمجھیو مجذوب کو اوروں سا — ہے وہ خلف سودا اور اہل ہنر بھی ہے

۳۔ ہے ضد بھڑکا اور نے وہ زور بخشتا ہے نثار — ایک پل میں دو گروں اژدہے کے کلے چیر کر

ان کی غلط فہمی یقین کی حد تک پہنچ گئی۔ اس لئے انھوں نے ان شاگردوں کی ہجوؤں میں سودا کو بھی لپیٹ لیا۔ نتیجہ میں مروت اور وضعداری کے تقاضے جو دونوں کو ملحوظِ خاطر تھے اب باقی نہ رہے۔

میر نے حجام کلو کی ہجو "در مذمت آئنہ دار" میں سودا کو خوب رگڑے دی ہے۔

میر و مرزا میں حکم ہوئے خرد
نے کہ نائی جن پہ سب کا دست رد
سمجھے مرزا میر کو مرزا کو میر
نے وہ رگ زن جو نہ سمجھے شیر شیر
مجھ میں مرزا میں تفاوت ہے بہت
یاں تنائی واں عدالت ہے بہت
جس جگہ میں نے رکھی منہ میں زباں
ہوتے اس جا گہ جو مرزا بے گماں
استرے کانوں میں اپنے باندھ کر
کب کے اب تک گھس گئے ہوتے ادھر

سودا بھی بہت بے باک تھے۔ بات کہنے سے کب چوکتے تھے۔ جب انھوں نے مرزا مظہر جیسے متقی اور پرہیزگار شخص کو نہ بخشا تو پھر کسی اور کی کیا پرواہ کرتے۔ اب معاملہ ادب و احترام کی حد میں نہ رہ کر بے ادبی تک پہنچ گیا۔

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ
سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
القصہ اس کا حال یہی ہے جو سچ کہوں
کتا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

سودا نے میر کی سیادت پر چوٹ کی   اس واقعہ کو آزاد نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے "کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ جب انھوں نے میر تخلص کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے۔ اس وقت انھوں نے خیال نہ کیا اور رفتہ رفتہ ہو ہی گئے" سودا کا ایک قطعہ بھی سن رسیدہ لوگوں سے سنا ہے۔ مگر کلیات میں نہیں ہے۔ شاید اس میں یہی اشارہ ہو۔

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کر کے میر
کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر

آخر میں کہتے ہیں۔

میری کے اب تو سارے مصالحے ہیں مستعد
بٹیا تو گندنا ہے اور آپ کو نخود میر

یعنی سودا کے خیال میں میر سید نہیں تھے بلکہ نانبائی کی اولاد تھے۔ یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ سودا میر کو استاد تسلیم کرنے کے بعد براہ راست تو ان کے کلام کی تنقیص نہ کر سکے لیکن ایک ہجو میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ ایک کاتب کی زبانی سب کچھ کہلوا دیا۔ جب کہ میر ان کو ملک الشعرا لکھ کر بھی اپنی زبان سے انھیں جاہل کہہ گئے۔ یہ قطعہ ان کی کلیات میں بعنوان "ہجو میر تقی میر" موجود ہے۔

ایک مشفق کے گھر گیا تھا میں   سنئے ٹک نقل یہ عجائب ہے
ان کے گھر میں ہے اک مرد بزرگ   خوشنویسی کے فن سے کاسب ہے
راقم سرنوشت کا اس کو   ہے بجا گر کہوں کہ نائب ہے
کہنے لاگا وہ آکے مجلس میں   آہ یہ نفس شوم غالب ہے

ورنہ نکھنے سے ہاتھ اٹھاؤں میں | کیا کروں فکر قوت واجب ہے
میں جو پوچھا سبب کہا مت پوچھ | بات کہنی یہ نامناسب ہے
لیکن اس واسطے میں کہتا ہوں | ورنہ سننے کا تو جو طالب ہے
ہے جو کچھ نظم و نثر دنیا میں | زیر ایراد میر صاحب ہے
ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح | لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے۔[۱]

اس طرح انھوں نے میر کی شاعری کے ساتھ ان کی نثر کو بھی ناقص قرار دیا۔

میر بھی ذاتیات پر اتر آئے انھوں نے ہجو عاقل "ہم نا کسے کہ بہ سگاں ابریشم تمام داشت"[۲] میں سودا کی خوب مذمت کی ہے۔ اس میں اگرچہ سودا کا نام نہیں لیا گیا مگر شواہد سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ ہجو سودا کی ہی شان میں لکھی گئی ہے۔

سودا کو کتے پالنے کا شوق تھا۔ بلکہ بقول خلیق انجم یہ شوق ان کی آخر عمر تک باقی رہا۔ چونکہ مذہبی نقطہ نظر سے کتا پالنا ناپاک ہے۔ اس لئے میر کو ان کی تحقیر کے لیے اس سے اچھا کیا بہانہ مل سکتا تھا۔ انھوں نے سودا کے اس شوق کو انتہائی مذموم قرار دیا۔ اب میر کی زبان سے یہ بھی سنئے

---

[۱] کلیات سودا، ص ۳۰۸

[۲] قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ "میر اس بات پر خاموش ہے۔ مگر قرینہ ہے کہ عاقل سے سودا مراد ہے۔ تذکرہ ہندی میں ہے کہ "سودا بپرورش سگاں ابریشم پشم شوق تمام داشت۔ کلیات سودا، طبع دہلی کے ایک مخمس کا عنوان ہے "در جواب طعن میر تقی" اس کا ایک شعر ہے۔

اکثر تو میرے خبث میں کہتا ہے یہی بات | کتوں میں فلانے کی شب و روز ہے اوقات

کلیات مذکور میں ایک قطعہ بھی ہے۔ بقیہ آگے

کہ مرزا کو کتوں سے کس قدر رغبت تھی۔

کتے ہیں پاس، کتے ہیں جیب و کنار میں — کتے ہیں آستینوں میں کتے ازار میں
آیا جو ایک روز وہ بے تہہ چلا ہوا — کتا ازار اس کے سے نکلا بندھا ہوا
یک سگ گزیدہ کی سی طرح جھومنے لگا — پھر کھول اس کے منھ کے تئیں چومنے لگا
ایسی بھی ہم نے دیکھی نہیں کتوں کی ہوس — گردن میں اپنے ڈالے پھرے روز و شب مرس

میر کو بلیوں کا شوق تھا۔ اپنی ایک مثنوی "موہنی بلی" میں ان کی وفاداری کی تعریف بھی کی ہے۔ یہاں لکھتے ہیں۔

بلی جو پالنا تو بھلا ایک بات تھی — آئین میں اس کی دوستی ایمان کے ساتھ تھی

سودا کو اس طرح آڑے ہاتھوں لیا۔

کتوں کی جستجو میں ہوا روڑا باٹ کا — دھوبی کا کتا ہے کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا
تھکتا ہے پھر جو کرتے ہوئے ونڈ اور دھپاڑ — لیتا ہے بے دماغ ہو لوگوں کے کپڑے پھاڑ
جو ہڈیوں پہ پڑتا رہا ہے بسان سگ — ہو آدمیت اس کو بھلا کس مقام تک
انساں کو انس کتوں سے اتنا ہوا ہے کب — ناپاک لوگ جانتے ہیں پاکیزہ لوگ سب

گزشتہ سے پیوستہ

ایک عاقل نے یہ سودا سے کہا از سر پند ۔ دل میں پایا ہوں ترے الفت سگ کا بوفور
(عہد دبستاں ص ۱۴۵)

اظہر راہی نے اپنے مضمون "میر کی ہجویہ شاعری" میں لکھتے ہیں۔

" اصل میں یہ مثنوی سودا کی شان میں کہی گئی ہے۔ جنھیں کتوں کا بہت شوق تھا۔ سودا اپنے اس شوق کا ذکر تردی کی ہجو اس طرح کرتے ہیں

سن بے الو پہنچ کے بنگالے — مادہ سگ آپ کو تو بنوا لے
میرے تئیں گو ہے بسکہ ذوق سگ — سگ بہت خوب میں نے ہیں پالے

دلی کالج میگزین، میر نمبر، ص ۱۸۷

پھر اس کا انجام یہ دکھایا۔

جس کو خدا خراب کرے پھر وہ کیا کرے
کیوں کر زباں نکالے نہ جوں سگ پھرا کرے

آواز سے نہ کتوں کو توڑے ہے اپنی جان
مر جائیگا یہ بھونکتے ہی بھونکتے ندان

سودا نے اس کے جواب میں ایک مخمس لکھا جو کلیات سودا میں موجود ہے۔ اس مخمس کے دس بند ہیں۔ اس کا عنوان "مخمس در جواب طعن میر تقی کہ فی الحقیقت میر شیخ بودہ است" ہے سودا نے اس ہجو میں میر کے اعتراض کا جواب دیا ہے۔ اور پھر ان کے زہد و تقوی کی خبر لی ہے۔

اکثر تو میرے خبث میں کہتا ہے یہی بات
کتوں میں ملا رہے کی شب و روز بے اوقات

خود اس کی نجاست کا نہیں کتے پہ اثبات
لازم ہے مسلماں نہ کرے اس سے ملاقات

یہ چاہیئے صحبت سے کرے ایسے کی اکراہ

یہ سچ ہے جو کہتا ہے تو مجھ یہ یقیں ہے
کتے کو کہے پاک سو وہ دشمن دیں ہے

لیکن وہ سگ نفس نجس اس سے کہیں ہے
تجھ پہ جو ہر اک لمحہ و ہر آن تعیں ہے

تو اس کا نہ کہنا کرے تب پاک ہے واللہ[1]

اس کے بعد کتوں کے شوق کا ایک اخلاقی پہلو بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

کتنے سے شب و روز جو رکھتا ہوں میں صحبت
دیتا ہے مجھے یاد وفا اور قناعت

کس طرح بتا اس کی مرے دل میں نہ ہو چاہ

....

آخر میں اپنے شوق کو جائز قرار دے کر میر پر علت مشائخ کا الزام لگاتے ہیں جو

---

[1] کلیات سودا، جلد اول، مرزا رفیع سودا، مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۳۲ء

[2] ایضاً ص ۵۴

سگ پرستی سے زیادہ ناپاک اور غیر مستحسن ہے۔ لکھتے ہیں۔

کتے کا ملوث تو تنہا پاک ہو آوے
علت کہ مشائخ کے جو دھوتے سے نہ جاوے

خالی کریں دھو دھو اسے زمزم کا اگر چاہ

اس کے علاوہ ایک قطعہ اور لکھا ہے جس میں میر کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ کتے پالنے والا اسی وقت قابل گرفت ہے جب اس کا کتا کاٹنے لگے۔ مگر تیرے نفس کے کتے نے تو تو مجھے بغیر کاٹے ہی کاٹ لیا۔ اب اگر تو یہ چاہے کہ میرا کتا بھی تجھے کاٹ کھائے تو یہ نہ ہوگا۔ اس قطعہ کا عنوان ہے "قطعہ بطور پند" اس میں گیارہ اشعار ہیں۔ یہ کلیات سودا میں شامل ہے۔[1] کچھ شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

ایک عاقل نے یہ سودا سے کہا از سر پند
دل میں پاتا ہوں ترے الفت سگہا بہ فزوں

سن کے بولا کہ تو اے دوست یہ کیا کہتا ہے
پر جو اب اس کا تجھے دوں جو اس میں ہو کر مجبور

میرے نزدیک ہے یوں یہ جو ہاں اپنے ہم جنس
حق نجاست سے رکھے ان کے سگ نفس کو دور

سو تو یہ سگ نہ جدا تجھ سے ہوا تے ہو گا
اس نصیحت سے مگر دل شکنی تھی منظور

کاٹتا ہے کاٹے ترے سگ نے تجھے نزد یار
سگ مرا بھی جو تجھے کاٹے مجھے رکھ معذور

میر اور سودا کے معرکے کے سلسلے میں یہ بات بھی نہ بھولنی چاہیے کہ تنہا میر اور سودا کا مقابلہ نہ تھا بلکہ سودا کے ساتھ ان کے شاگرد بھی شامل تھے۔ جو موقعہ بے موقع سودا کی حمایت میں میر کو نشانہ بناتے رہتے تھے۔ اس معرکہ آرائی میں فریقین کی جو گت بنی وہ ان واقعات سے بخوبی ظاہر ہے۔ اگرچہ معرکہ دونوں جانب سے لفظی جنگ تک ہی محدود تھا۔ مگر پھر بھی میر اور سودا جیسی عظیم

---

[1] کلیات سودا، جلد دوم، مطبع نولکشور لکھنؤ، ۱۹۳۲ء، ص ۵۴۳

شخصیتوں کے لئے یہ بات نہایت معیوب تھی کہ وہ آپس میں لعن طعن کریں ۔ اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہیں جب کہ وہ ایک دوسرے کے کمال فن سے آگاہ تھے ۔ اور سماج میں بھی ان کو بڑی حیثیت حاصل تھی ۔ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب لکھتے ہیں "میرے خیال میں میر اور سودا نے ایک دوسرے کی ہجو اسی وقت کہی جب تک سودا دہلی میں تھے ۔ میر کی ہجو کا ایک مصرعہ ہے

دلی میں تین کتیاں کہاں سے کے پالیاں

بعض محققین نے اس مصرعے کے پیش نظر یہ ثابت کیا ہے کہ ہجو سودا کے ترک وطن کے بعد کہی گئی ۔ حالانکہ اس مصرع سے یہ ثابت نہیں ہوتا"[1]

خلیق انجم صاحب کے قول کے مطابق اگر یہ معرکے صرف دہلی تک ہی محدود رہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ بعد میں دونوں کے دلوں سے غبار کدورت دور ہو گیا تھا ۔ . . . .

اور اس تجدید تعلقات میں پہلے سے زیادہ استواری پیدا ہو گئی تھی ترک وطن کے بعد سودا نے اپنے وطن اور اہل وطن کو یاد کیا ۔ لیکن جن اشعار میں وہ میر صاحب کا ذکر کرتے ہیں ان سے ان کے انتہائی خلوص اور محبت کا پتہ چلتا ہے ۔ اشعار یہ ہیں ۔

ہمیں لے آئی ہے شہر غریب جس دن سے
کبھی انھوں کی طرف سے نہ نامہ و پیغام
علی الخصوص تغافل کو میر صاحب کے
کہوں میں کس سے کہ باوصف اتحاد تمام
لکھا نہ پرچہ کاغذ ہی اتنی مدت میں
کہ بے قراروں کو تا ہووے موجب آرام

---

[1] مرزا محمد رفیع ، ص ۲۹۸

میر صاحب کا یہ شعر بھی اتحاد و محبت کا آئینہ دار ہے۔

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی
گیا ہے میرؔ دیوانہ رہا سوداؔ سو مستانہ

سوزؔ، سید محمد میر

ان کا[1] تخلص سوزؔ تھا۔ اور نام سید محمد میر۔ ان کے باپ سید ضیاء الدین تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے۔ اور حضرت قطب عالم گجراتی کی اولاد میں تھے۔
سوزؔ دہلی میں قراول پورہ میں رہتے تھے۔ پہلے میرؔ تخلص کرتے تھے اور بعد میں سوزؔ تخلص کر لیا تھا۔ شاہ عالم کے زمانے میں جب دہلی کی فضا خراب ہوئی تو ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ پہنچے۔ مگر وہاں سے ۱۲۱۲ھ میں ناکام مرشد آباد چلے گئے۔ یہاں بھی پریشان رہے۔ پھر لکھنؤ آئے۔ نواب آصف الدولہ نے ان سے تلمذ اختیار کیا۔ اور کچھ دنوں بعد ۱۲۱۳ھ میں لکھنؤ میں ۷۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

اولاد میں داغؔ تخلص کے ان کے بیٹے تھے۔ جن کا انتقال جوانی میں ہی ہو گیا۔ اور مرنے کے بعد ان کا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

صاحب دیوان شاعر تھے۔ غزل کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا۔

میر سوزؔ اور میر تقی میرؔ کے معارضہ کا ذکر قائمؔ نے اس طرح کیا ہے۔
"سیادت پناہ محمد میر متخلص بہ خوشنویس بے نظیرے است۔ خط شکستہ و شفیعا ے خوب می نویسد۔ گاہے از موسیقی آگاہ و در مبادی حال میر تخلص می

---

[1] خواجہ احمد فاروقی اردوئے معلی، میر سوز نمبر سے حالات زندگی اخذ کئے گئے۔

نمود چوں اورا با میر تقی معارضہ افتاد ازاں باسوز تخلص کرد۔۔۔۔ اکثر بمدیارِ معلی ملاقات میشود“ [۱]

میر سوز کو اس بات پر بہت ناگواری تھی کہ انھیں میر تقی میر کی وجہ سے اپنا تخلص چھوڑنا پڑا۔ میر تقی میر ریختہ گوئی میں نام پیدا کر رہے تھے۔ اور میر تخلص کے ساتھ تمام اطراف و اکناف میں مصروف ہو چکے تھے۔ اب میر سوز کے لئے سوائے اس کے کہ اپنا تخلص تبدیل کریں اور کوئی راستہ نہ تھا۔ انھیں میر سے بھی یہی شکایت رہی۔ اپنے دوستوں کی محفلوں میں بھی سوز اسکا ذکر کرتے تھے۔

ایک شعر میں اپنے دونوں تخلصوں کو باندھا ہے۔

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ ہوئے ہزار حیف
اب جو کہیں ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

میر تقی میران کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اول تو انھیں شاعر ہی تسلیم نہیں کیا۔ اگر لوگوں نے مجبور بھی کیا تو صرف پاؤ شاعر کہا اور آگے نہ بڑھے مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

”لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کہ کیوں حضرت (میر) آج کل شاعر کون کون ہے۔ کہا اب تو سودا اور دوسرا خاکسار ہے۔ اور کچھ تامل کر کے کہا۔ آدھے میر درد کوئی شخص بولا کہ حضرت! میر سوز صاحب؟ چیں بچیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ انھوں نے کہا استاد نواب آصف الدولہ کے ہیں۔ کہا کہ خیر یہ ہے تو پونے تین سہی۔ مگر شرفا میں ایسے تخلص کبھی نہیں سنے۔“ [۲]

---

[۱] مخزن نکات، ص ۴۸

[۲] آب حیات، ص ۲۱۸

اس واقعہ کو اگر آزاد کی انشا پردازی ہی سمجھ لیا جائے تو پھر اس کو کیا کہیں گے کہ میر نے نکات الشعرا میں میر سوز کا کہیں ذکر ہی نہیں کیا۔ حالانکہ دوسرے تذکرہ نگاروں نے ان کو صاحب طرز شاعر کہا ہے۔

میر قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں۔

"در ریختہ گوئی طرز خاص دارد، رو بہ شعر خوانیش از کس نمی آید بہ تتبع طرز گفتارش اگرچہ اکثرے از مشتاقان ایں فن گرائیدہ اما کمتر کسے سخن بہ اندازہ شے رسانیدہ" [۱]

اسی طرح مرزا علی لطف نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔

"فن سخنوری میں استاد، طرز و ادا بندی کے بادشاہ اور صورت مضمون درد و آہ تھے" [۲]

ان بیانات سے یہ خیال نہیں کیا جاسکتا کہ میر سوز قابل ذکر شاعر نہ تھے۔ میر سوز کو یکسر نظر انداز کر دینا میر کی زیادتی ہے۔

میر سوز کو ان کے اس رویہ کا کافی احساس تھا۔ لہذا موقع پڑنے پر وہ بھی ان کو خوب سناتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ایک واقعہ بیان کیا ہے انھیں کے الفاظ میں سنئے۔

"کسی شخص نے ان سے (میر سوز سے) آکر کہا کہ حضرت! ایک شخص آپ کے تخلص پر آج ہنستے تھے۔ اور کہتے تھے سوز کو زکیا تخلص رکھا ہے۔ ہمیں پسند نہیں۔ انھوں نے کہنے والے کا نام پوچھا۔ اس نے بہت بعد بہت سے انکار

---

[۱] مجموعہ نغز، ص ۳۲۰
[۲] گلشن ہند، ص

اور اصرار کے بتایا۔ معلوم ہوا کہ شخص موصوف بھی مشاعرے میں ہمیشہ آتے ہیں۔ میر سوز مرحوم نے کہا۔ خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ اب کے صحبت مشاعرہ میں تم مجھ سے بر سرِ جلسہ یہی سوال کرنا۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور باآواز بلند پوچھا، حضرت آپ کا تخلص کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ صاحب قبلہ فقیر نے تخلص تو میر رکھا تھا۔ مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا۔ فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کمال کے سامنے میرا نام نہ روشن ہو سکے گا۔ ناچار سوز تخلص کیا (شخص مذکور کی طرف اشارہ کر کے کہا) سنتا ہوں یہ صاحب گوز کرتے ہیں۔ مشاعرے میں عجیب قہقہہ اڑا۔ لکھنؤ میں ہزاروں آدمی مشاعرے میں جمع ہوتے تھے۔ سب کے کانوں تک آواز نہ گئی تھی۔ کئی کئی دفعہ کہوا کر سنا ادھر شخص موصوف، ادھر میر تقی صاحب دونوں چپ چاپ بیٹھے سنا کئے۔"[1]

بہر حال بقول قائم۔ اس جھگڑے کی جڑ یہی تخلص تھا۔ جس نے دونوں استادوں میں رنجش پیدا کر دی تھی۔

---

[1] آبِ حیات ، ص ۱۹۸

قائم، قیام الدین

قیام الدین نام اور قائم تخلص تھا۔ چاند پور نگینہ کے رہنے والے تھے بچپن میں ہی دہلی آ گئے تھے۔ اور طویل عرصہ تک یہیں رہے۔ تذکرہ شعرائے اردو کی تالیف کے وقت بقول میر حسن سنبھل مراد آباد میں مقیم تھے۔ قائم نے لکھا ہے کہ آخر میں امروہہ کے قاضی مقرر ہو گئے تھے۔ مصحفی کی قائم سے ملاقات نواب محمد یار خاں کے دربار میں ہوئی۔ اور انھیں کے ذریعے انھوں نے نواب کا قصیدہ پڑھا۔ اور پھر ان کو وہاں ملازمت مل گئی۔ قائم کے پاس نواب کی غزلوں کے جتنے مسودے آتے تھے ان کو مصحفی کے حوالے کر دیتے تھے۔ مصحفی ان پر باقاعدہ اصلاح کرتے۔ جب کٹیھر کی آبادی برہم ہو گئی۔ تو قائم نواب یار خاں کے ملازم ہو کر رام پور آ گئے۔

قائم پہلے ہدایت اللہ ہدایت کے شاگرد تھے۔ کسی بات پر ان سے ناراضگی ہو گئی تو انھوں نے ان سے تعلق ختم کر لیا۔ کچھ دن خواجہ میر درد کے شاگرد رہے۔ اس کے بعد انھوں نے محمد رفیع سودا کا تلمذ اختیار کر لیا۔

مرزا علی لطف (صاحب تذکرہ گلشن ہند) شیفتہ (صاحب گلشن بے خار) امیر مینائی (صاحب انتخاب یادگار) اور حافظ احمد علی خاں شوق نے ان کا

؎ خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا، علیگڑھ ص ۸۶ سے حالات زندگی لیے گئے۔

سال وفات ۱۲۱۰ھ بتایا ہے۔ لیکن جرأت کی تاریخ سے ۱۲۰۸ھ نکلتا ہے۔

جرأت نے بھی یوں کہی تاریخ وفات یکتائی کے ساتھ
قائم بنیاد شعر ہندی نہ رہی کیا کہیئے اب آہ

قائم میر اور سودا کے بعد اپنے دور کے سب سے نمایاں شاعر ہیں۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ "در پختگی کلام و چستی مصراع غزل و روپہ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدوش استاد راہ می رود بلکہ در بعض مقام غلبہ می جوید"۱ مولانا محمد حسین آزاد نے ان کے کلام کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے "انکا دیوان ہرگز میر و مرزا کے دیوان کے نیچے نہیں رکھ سکتے۔ مگر کیا کیجے قبول عام اور شے ہے شہرت نہ پائی"۲

فتح علی گردیزی نے بھی ان کی شاعری کو سراہا ہے "شعرش پسندیدہ است و فکرش سنجیدہ"۳ دیوان قائم کو دیکھ کر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قائم صاحب طرز شاعر تھے۔ ان کے یہاں ایک انداز ہے، جو ان کی انفرادیت اور طرز خاص کا مظہر ہے۔

آج قائم کے شعر ہم نے سنے
ہاں اک انداز تو نکلتا ہے

قائم میں جہاں اعلیٰ درجہ کی شاعرانہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہاں ان کے مزاج میں لاابالی پن بھی تھا۔ اس لاابالی پن نے انھیں بدنام بھی کیا ہے۔ چنانچہ اپنی اس افتادِ طبع کے نتیجے میں اپنے پہلے استاد ہدایت اللہ ہدایت کی ہجو میں ایک قطعہ لکھ ڈالا۔

۱؎ مصحفی، تذکرۂ ہندی، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، ص ۱۷۹
۲؎ آب حیات، ص ۱۵۶ حاشیہ
۳؎ گردیزی، تذکرہ ریختہ گویاں، مرتبہ مولوی عبدالحق اورنگ آباد ۱۹۳۳ء، ص ۱۲۳

حضرت درد کی خدمت میں جب آقائم نے
عرض کی یہ کہ اے استادِ جہاں سنتے ہو!
امر ہو وے تو ہدایت کو کروں میں سیدھا
واں سے ارشاد ہوا یہ کہ میاں سنتے ہو
راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کبھی کج طینت
تیر بنتی ہے کہیں شاخ کماں سنتے ہو ؎[1]

آزاد لکھتے ہیں۔

"شاہ موصوف باوجودیکہ حد سے زیادہ خاکساری طبیعت میں رکھتے تھے۔ مگر انھوں نے بھی ایک قطعہ ؎ ان کے حق میں کہا۔ پھر خواجہ میر درد کے شاگرد ہو گئے ان کے حق میں بھی کچھ کہہ سن کر الگ ہو گئے۔ پھر مرزا کی خدمت میں آئے اور ان سے پھرے مرزا تو مرزا تھے انھوں نے سیدھا کیا۔" ؎[2] قدرت اللہ قاسم نے بھی لکھا ہے کہ قائم آخر میں سودا کے شاگرد ہو گئے تھے، مگر اپنی "خباثت اصلی" کی وجہ سے ان کی شاگردی سے بھی پہلو تہی کی۔ سودا نے انکی ہجو میں ایک ساقی نامہ کہا جس میں قائم کے معافی مانگنے پر انھوں نے ایک فرضی نام فوقی ڈال دیا

ساقی نامہ کے ابتدائی اشعار حسب ذیل ہیں۔

تک میاں فوقی کے گھر تک اے صبا — کہہ سلام شوق تیرا کر مرا!
بعد ازاں کہیو کہ اتنا بھی غرور — شاعری کے فن میں کرنا کیا ضرور!

؎[1] چشم انصاف سے دیکھو تو میاں قائم تم — چاہئے یوں کہ ہدایت کو اب استاد کرو
اور جو کچھ شاعری کا دل میں تمہارے ہو گھمنڈ — کہہ چکے ہم تو غزل بار سے تم ارشاد کرو

قاسم المحبوبہ جلد ۲ ص ۸۳

(بقیہ آگے صفحہ پر)

اوروں کو بجری کہو شیر آپ کو
بجری بھی گر کچھ کہے پھر آپ کو
بات بجری کی لگے تم کو بری!
دوڑو تم اس پر قلم کی لے چھری

ان اشعار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ قائم نے سودا کی ہجو میں پہل کی تھی۔ اور پھر سودا نے اس کا جواب دیا۔ یہاں سودا قائم پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ متبذل بندا ور ایک عالم کے چور ہیں۔

ہو گیا ظاہر جو کچھ تھا تم میں زور
متبذل بند اور اک عالم کے چور

اس کے بعد سودا نے قائم کی ایک غزل پر بھی کڑی تنقید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قائم کو سودا سے معافی مانگنی پڑی پھر دونوں کے دل صاف ہو گئے۔

بہر حال قائم سودا سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے سودا کی مدح میں ایک قصیدہ بھی کہا تھا۔ جو ان کے دیوان (نسخہ انڈیا آفس) میں موجود ہے۔ سودا کی وفات کے بعد قائم نے اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

پڑھیئے کس کا سخن کہ دل سے مٹے
داغ مرزا رفیع سودا کا

ہو سکتا ہے کہ قائم سودا کا حق شاگردی ادا کرنے کے لئے میر کے مقابلے پر آتے ہوں قائم کے بعض اشعار سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ میر کے مقابلے پر مشاعروں میں غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ انھوں نے اس پر فخر کیا ہے کہ یہ سودا کا ہی فیضان صحبت ہے جو میں طرح غزل میں میر سے بہتر کہتا ہوں۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۴۷)

۲ہ آب حیات ص ۱۵۶ ۳ہ مجموعہ نغز جلد ۲، ص ۸۲

قائم یہ فیض حضرت سودا ہے ورنہ، میں
طرح غزل سے میر کی آتا نظر کہیں۔۔

در حقیقت وہ سودا کے سوا کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

ایک سودا کی تو قائم نہ کہوں میں ورنہ
ہے ترا طور سخن حد بشر سے باہر

میر کے یہاں قائم کے بارے میں کوئی ہجو نظر نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر نے بھی ان کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا تھا جو سودا نے بقا کے ساتھ کیا۔ البتہ نکات الشعراء میں میر نے قائم کے متعلق جو رائے پیش کی ہے۔ وہ قابل توجہ ہے۔

" محمد قائم المتخلص بہ قائم، جوانے است خیرہ وطیرہ، حسن پرست، نوکر پیشہ مدتے داخل جرگہ میاں خواجہ میر صاحب ماند۔ اکنوں با مرزا رفیع محشور است با فقیر نیز آشنا است " [۱]

میر نے یہاں قائم کی شاعرانہ صلاحیتوں کا مطلقاً ذکر نہیں کیا۔ بلکہ ان کے اخلاق و خصائل میں بھی مختصراً یہی کہا کہ وہ خیرہ وطیرہ " اور حسن پرست ہیں۔ خواجہ میر درد اور مرزا رفیع کی شاگردی کے ذکر کے بجائے، داخل جرگہ میاں خواجہ میر اور با مرزا رفیع محشور است " لکھا ہے۔ جبکہ میر حسن ان کے کافی مداح ہیں۔

" نخل حدیقہ فصاحت، غنچہ بوستان بلاغت، شمع بزم سخن دانی، چراغ خانہ نکتہ دانی، ترقی فکرش دائم، شیخ محمد قائم شاعرے ست خوش گو، شاہین طبیعتش تیز بال و شہباز فکرش بہ اوج کمال، خوبی اشعارش چوں حسن خوباں دل پذیر، در ربط الفاظش مسلسل مانند زلف خوباں بے نظیر " [۲] آخریں " با فقیر

---

[۱] میر تقی میر، نکات الشعراء، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۱۲۲

[۲] میر حسن، تذکرہ شعرائے اردو، مرتبہ محمود شیروانی دہلی، ۱۹۴۰ء، ص ۱۲۸

نیز آشنا است "کہہ کر میر دو سطروں میں ان کا حال ختم کر دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ چونکہ تذکرہ نکات الشعراء میر کی دل برگشتگی کا بھی آئینہ دار ہے ۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ قائم بھی میر کی ذاتی رنجش کا شکار ہو گئے ہوں ۔

اپنے استاد سودا کی طرح قائم نے بھی میر کی سیادت پر چوٹیں کی ہیں ۔ کلیات مملوکہ ڈاکٹر عبدالحق، اور عمدہ منتخبہ میں قائم کی یہ رباعی[۲] ملتی ہے ۔

رنڈی کے لئے کہائے تم میر جی میر
کہئے تو بجا ہے آپ کو میر حمیر
پر میر ہوئے شاید اوس طرح کے جیسے
ساگوں میں کو تھمیر راگوں میں حمیر[۳]

اس رباعی سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قائم نے سودا کی ہاں میں ہاں ملائی ہے ۔ اور اس مشکل وقت میں اپنے استاد کا ساتھ دیا ہے ۔

۱۔ کلیات قائم، مملوکہ ڈاکٹر عبدالحق، ص ۲۵ بحوالہ حیات میر، کلب علی خاں فائق، ص ۵۷

۲۔ میر محمد خاں، عمدہ منتخبہ یعنی تذکرہ سرور، مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، دہلی ص ص ۵۰۸، ۵۰۹

۳۔ بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کر کے میر کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر

کمترین، میر خاں

میر خاں نام اور کمترین تخلص، شاہ مبارک آبرو اور شاکر ناجی کے معاصرین میں سے تھے۔ یہ دلی کے ایک قدیمی شاعر تھے۔ میر تقی میر اور سودا کے زمانے میں حیات تھے۔ قائم نے مخزن نکات میں بتایا ہے کہ یہ ہزل گوئی اور ہجو پردازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک شہر آشوب جس میں اہل حرفہ کی مذمت کی گئی ہے یادگار چھوڑا۔ یہ سات سو اشعار پر مشتمل ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ان کی اس طرح تصویر کشی کی ہے۔

" تخلص میں یہ نکتہ رکھا تھا کہ قوم کے افغان تھے۔ ترین فرقہ کا نام تھا کمترین تخلص کیا تھا۔ بہت سن رسیدہ تھے۔ شاہ آبرو اور ناجی کے دیکھنے والوں میں تھے۔ مگر چوتھے طبقے کے شاعروں میں موجود ہوتے تھے۔ پرانے سپاہی تھے۔ کچھ بہت علم بھی نہ تھا۔ طبقہ اول کے رنگ میں ایہام کے شعر کہتے تھے۔ خوش مزاج بھی تھے اور غصیل بھی تھے۔ اور وقت پر جو سوجھ جاتی تھی اس میں چوکتے نہ تھے۔ صاف کہہ بیٹھتے تھے۔ کوئی ان کی زبان سے بچا نہیں۔ مگر وہ زمانہ بھی ایسا تھا کہ علما، شرفا سب سنتے تھے۔ اور ہنس ہنس کر برداشت کرتے تھے۔

لے آب حیات، ص ۱۱۱

لے قائم، مخزن نکات، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ص ۳۲

وضع بھی دنیا سے نرالی رکھی تھی۔ ایک بڑی سی گھیر دار پگڑی سر پر باندھتے تھے لمبا سا دوپٹہ بل دے کر کمر تک لپیٹتے تھے۔ ایک قلم ہاتھ میں رکھتے تھے اپنے اشعار کہ میر جعفر مرحوم کی زٹل کی طرح چٹ پٹے ہوتے تھے۔ خود پرچوں پر لکھ کر کمر میں رکھتے تھے ان دنوں ہر جمعہ کو سعد اللہ خاں کے چوک پر گزری لگتی تھی وہاں جا کھڑے ہوتے تھے۔ لڑکے اور شوقین مزاج خاطر خواہ دام دیتے تھے۔ اور ایک ایک پرچہ خوشی خوشی لے جاتے تھے"۔ [۱]

میر تقی میر نے بقول آزاد اپنے تذکرے نکات الشعرا میں ولی کے متعلق لکھا تھا۔

"ـ شاعر یست از شیطان مشہور تر" ان دنوں ولی کو قبول عام حاصل تھا۔ اس کی شاعری نے نہ صرف پورے دکن کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا بلکہ شمالی

---

[۱] آب حیات، ص ص ۲۱۱ ۲۱۲

[۲] نکات الشعرا کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس میں ولی کا ترجمہ یہ ہے "شاعر ریختہ از خاک اورنگ آباد است میگویند کہ در شاہجہاں آباد دہلی نیز آمدہ بود بخدمت میاں گلشن صاحب رفت، واز اشعار خود پارۂ خواند۔ میاں صاحب فرمود، این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند، در ریختہ خود بکار ببر، از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔ از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد واحوالش کما ینبغی معلوم من نیست، نکات الشعرا ص ص ۸۹، ۹۰۔ اس عبارت میں یہ فقرہ کہیں بھی موجود نہیں۔ البتہ میر قدرت اللہ قاسم نے مجموعۂ نغز میں کمترین کے بیان میں اس کا ذکر کیا ہے "چنانچہ بنابر نوشتن میر در تذکرۂ خود شاعر شان ملی المتخلص بہ ولی را کہ ـ

بقیہ آگے حاشیے پر

ہندوستان بھی ان سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ آج بھی ان کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس لیے ایسے شخص کی شان میں ایسا فقرہ کہنا کمترین جیسے سن رسیدہ بزرگ کو بہت ناگوار گزرا۔ انھوں نے غصّے میں آکر میر کے خلاف ایک نظم لکھی۔ جس میں ان کو بہت کچھ کہا آخر میں یہاں تک کہہ دیا۔ ع

ولی پر جو سخن لائے اسے شیطان کہتے ہیں

میر نے اس نظم کو سنکر کچھ کہا۔ یا اس کے جواب میں کمترین کی کوئی ہجو لکھی۔ یہ ہمیں معلوم نہیں۔ البتہ نکات الشعرا میں میر ان کے بارے میں جو کچھ اظہار خیال فرماتے ہیں۔ اس سے ان کا ردعمل ظاہر ہو سکتا ہے۔

"مرد یست وارستہ، مزاجش میلان ہزل بسیار دارد۔ موافق استعداد خودی گوید۔ بندہ شعر معقول او نشنیدہ ام۔ گاہ گاہ در مجلس مراختہ کہ ایں لفظ بوزن مشاعرہ تراشیدہ اند ملاقات می شود۔ از شہر آشوب اوست"[۱]

میر کا یہ کہنا کہ وہ اپنی صلاحیت کے مطابق کہہ دیتے ہیں اور بندہ نے ان کا

گذشتہ سے پیوستہ

شاعریست از شیطان مشہور تر۔ ہجو پائے رکیکہ بہ واجبی نمود، ص ۴۴۳

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد نے میر قدرت اللہ قاسم کے ہی بیان کو بنیاد بنایا تھا۔ لیکن اس بات کے امکان ہیں کہ قاسم کے سامنے نکات الشعراء کا جو نسخہ موجود ہوگا اس میں یہ فقرہ بھی ہو۔ علیگڈھ لائبریری میں میر کی ایک ادھوری قلمی بیاض ملی ہے جو دراصل نکات الشعراء کا ہی ایک ناتمام حصّہ ہے اس کی بہت سی عبارتیں موجودہ نسخہ سے مختلف ہیں اور بیانات میں بھی بہت تضاد ملتا ہے۔ اس لئے یہ قرین قیاس ہے کہ میر نے ولی کا ترجمہ بعد میں تبدیل کر دیا ہو۔ نکات الشعراء، ص ص ۷، ۱۳۶۴

کبھی کوئی معقول شعر نہیں سنا۔ میر کی دل برگشتگی کا غماز ہے۔ جبکہ قائم نے ان کو ہزل گوئی اور ہجو پردازی کا بے مثل شاعر کہا ہے۔ اور ان کے سات سو اشعار کے ایک شہر آشوب کی نشاندہی کی ہے۔

مجذوب میر غلام حیدر

نام میر غلام حیدر تھا۔ پہلے حیدر تخلص کرتے تھے۔ بعد میں مجذوب تخلص اختیار کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مرزا محمد رفیع سودا کے بیٹے تھے۔ بعض تذکرہ نگار انھیں سودا کا متبنیٰ بتاتے ہیں۔ اس اختلافِ رائے کی وجہ سے اس سلسلے میں کوئی ایک بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ ہم اس کا جائزہ لے کر کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ قیام الدین قائم (صاحب تذکرہ مخزن نکات) میر حسن (صاحب تذکرہ شعرائے اردو) ابوالحسن امیر الدین (صاحب تذکرہ مسرت افزا) اور علی لطف (صاحب تذکرہ گلشن ہند) نے انھیں سودا کا بیٹا لکھا ہے۔ مردان علی خاں مبتلا (صاحب گلشن سخن) مصحفی (صاحب تذکرہ ہندی) اور شاہ کمال (صاحب مجمع الانتخاب) نے انھیں پرورده بتایا ہے۔ قدرت اللہ شوق (صاحب طبقات الشعرا) اس میں کچھ اور اضافہ کرتے ہیں: "مجذوب دہلی کے رہنے والے خوبصورت اور وجیہہ نوجوان ہیں۔ مرزا رفیع کے منظورِ نظر اور تربیت کردہ ہیں۔ سودا نے انھیں بچپن ہی سے اپنے لڑکے کی طرح پالا ہے۔ مصنف "مرزا محمد رفیع سودا" کا خیال ہے کہ وہ سودا کے ہی لڑکے تھے۔ بعد کے تذکرہ نگاروں کو غلط فہمی ہوئی۔ اور وہ اس کی

---

[1] خلیق انجم "مرزا محمد رفیع سودا" علیگڑھ ۱۹۶۶ء ص۔ ۹۰ تا ۹۳ سے حالات زندگی لیے گئے۔

ذیل میں مجذوب کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

خاطر میں کون لائے میرا سخن کہ مجھکو
سودا کا سنکے بیٹا مجذوب جانتے ہیں

لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔

سودا نے جس زمانے میں دہلی سے کوچ کیا ہے۔ مجذوب بھی غالباً انھیں کے ساتھ تھے۔ لکھنؤ میں مصحفی کی مجذوب سے ملاقات ہوئی تھی۔ مگر فرخ آباد کے متعلق کوئی شہادت نہیں ملتی۔ ۱

مجذوب خوش خلق اور باحیا انسان تھے۔ میر حسن نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ اگرچہ وہ دیر آشنا ہیں مگر جس سے ملتے ہیں خوب ملتے ہیں۔ سخندانی کے باوجود فطرتاً خاموش طبیعت اور کم گو ہیں۔ ۲ مرزا علی لطف کے لفظوں میں آشنا پرست اور وضعدار آدمی تھے۔ دردمند دل رکھتے تھے۔ طبیعت میں گداز تھا۔

مجذوب کو سودا سے تلمذ تھا۔ ریختہ کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ دو دیوان میر تقی میر کے جواب میں لکھے۔ لیکن اب ان کے دیوان کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ ان کا آخری زمانہ عسرت اور تنگ دستی میں گذرا۔ ۳

میر اور مجذوب کے تنازعے کا مطالعہ بعض وجوہ کی بنا پر کافی دشوار ہو گیا ہے۔ ایک طرف تو ہمیں مجذوب کے پورے حالات زندگی کا علم نہیں۔ جو ہماری

۱۔ خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا، علیگڑھ ۱۹۶۶ء، ص ۹۰ تا ۹۲ سے مجذوب کے حالات زندگی اخذ کئے گئے۔

۲۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۷۰، سے حالات زندگی لئے گئے۔

۳۔ گلشن ہند، ص ۲۲۶ سے حالات لئے گئے۔

تذکرہ نویسی کا بہت بڑا المیہ ہے۔ دوسرے ان کا دیوان بھی دست برد زمانہ کی نذر ہوگیا۔ میر نے بھی ان کا ذکر نہیں کیا۔ ممکن ہے نکات الشعراء کی تالیف کے وقت مجذوب بہت کم عمر ہوں۔ اس کے علاوہ کلیات میر میں بھی ہمیں کوئی ایسا شعر نہیں مل سکا جس سے مجذوب کے بارے میں کسی بات کا پتہ چلتا۔ البتہ بعض شہادتوں سے اتنا ضرور معلوم ہوگیا ہے کہ مجذوب سودا کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ اس لئے اس بات کے امکانات ہیں کہ انھوں نے اپنے استاد کی حمایت میں میر تقی میر کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا ہو۔ ویسے بھی میر کے مقابلے میں مجذوب تو عمر اور ناپختہ کار تھے۔ عمر کے جوش اور بردباری کے فقدان کی بنا پر میر کے مرتبہ کو کیوں کر پہچان سکتے تھے۔

مرزا علی لطف لکھتے ہیں۔

"ندو دیوان جواب میں میر تقی میر کے انھوں نے کہے۔ اور مقدور بھر سرانجام جواب سے غافل نہیں رہے"۔ [1]

شیخ چاند لکھتے ہیں۔

"نہ معلوم میر سے کیوں اس کی ان بن ہو گئی تھی۔ کہ ان کے جواب میں سات دیوان لکھے۔ ایک شعر میں ان کو مخاطب کر کے لکھا ہے

اے میر سمجھو مت مجذوب کو اوروں سا

ہے وہ خلف سودا اور اہل ہنر بھی ہے" [2]

مرزا علی لطف کے بیان کے مطابق مجذوب نے میر تقی میر کے جواب میں

---

[1] لطف، مرزا علی، گلشن ہند، عبداللہ خاں حیدرآباد دکن ۱۹۰۶ء ص ۲۲۶

[2] شیخ چاند، سودا، اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء، ص ۶۹

دو دیوان لکھے تھے ۔ لیکن شیخ چاند "سات دیوان" بتاتے ہیں ۔ اگرچہ سات دیوانوں کی بات کسی تذکرے سے ثابت نہیں ہوئی مگر اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مجذوب اور میر تقی میر کے درمیان کشیدگی موجود تھی ۔ مذکورہ شعر کے تیور بھی دونوں کی نوک جھونک کا پتہ دیتے ہیں ۔

بہر حال یہ معمولی قسم کی چھیڑ چھاڑ تھی ۔ جو سودا کے ساتھ مجذوب کی جذباتی وابستگی کا نتیجہ تھی ۔ وہ سودا کے بارے میں کسی کی کوئی غلط بات برداشت نہ کر سکتے تھے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میر نے کسی موقع پر انھیں کچھ کہہ دیا ہو جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے "خلف سودا" اور "اہل ہنر" ہونے کی میر کو دھمکی دی ۔

نثار، محمد امان

محمد[1] امان نام، اور نثار تخلص کرتے تھے۔ دہلی کے باشندے تھے۔ فن معماری میں کمال رکھتے تھے۔ یہ سعادت اللہ معمار کے بیٹے تھے۔ اور میاں استا معمار کی اولاد میں تھے۔ جنھوں نے دہلی کی جامع مسجد بنائی تھی۔ دہلی میں امرا و روسا سے منسلک رہے۔ ان کے مکانات کی تعمیر کا کام زیادہ تر یہی کرتے تھے۔ دہلی اجڑنے پر یہ بھی لکھنؤ چلے گئے اور اپنے آبائی پیشے کو ہی ذریعہ معاش بنایا۔ دہلی کی طرح لکھنؤ میں بھی ہمیشہ رئیسوں کی صحبت میں رہے۔ شعر بہت اچھا کہتے تھے۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ ریختہ کا ایک ضخیم دیوان ان کی یادگار ہے۔ جو اب کم یاب ہے۔ شاہ حاتم سے انھیں تلمذ تھا۔

آزاد نے لکھا ہے "میر صاحب کی اور ان کی اکثر چھیڑ چھاڑ رہتی تھی"[2]۔ اس چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن محمد امان نثار نے بھرے مشاعرے میں محمد تقی میر پر بڑے موقع سے چوٹ کی اور اس کی خوب واہ واہ ہوئی۔ ہوا یہ کہ میر تقی میر نے اپنی مثنوی "اژدر نامہ" مشاعرے کے اندر پڑھی۔ اس میں انھوں نے اپنے پندار کا مظاہرہ کیا تھا۔ پہلے انھوں نے اپنے آپ کو اژدہا

---

[1] آب حیات، ص ۲۱۸ سے حالات زندگی لیے گئے۔

[2] آب حیات ص ۲۱۸

قرار دیا۔ پھر معاصرین میں سے کسی کو سانپ، کسی کو بچھو، کسی کو چوہا، اور کسی کو کیڑے مکوڑے کہہ کر، ان کی تحقیر کی۔ اس مثنوی کے قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ دامن کوہ میں ایک خونخوار اژدہا رہتا تھا۔ جنگل کے تمام حشرات الارض جمع ہوکر اس سے لڑنے لگے۔ لیکن جب اژدہا سامنے آیا تو کوئی بھی اس کا مقابلہ نہ کرسکا۔ اور اس کی ایک پھنکار سے سب کے سب فنا ہو گئے۔

مثنوی "اژدر نامہ" کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

یہ موذی کئی نا خبر دار فن	نئی ناگنیں جن کے ٹھینگوں پہ پھن
نہیں جانتے ہوں میں مار سیاہ	زمانہ ہے آتش کا میری نگاہ
نفس ہے مرا افعی پیچ دار	گیا جس سے خصم قوی من کو مار

ان اشعار سے میر کی انانیت اور غرور و تبختر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگر یہاں وہ صرف اپنے کلام کی تعریف پر ہی اکتفا کرتے تو دوسرے لوگوں کو اتنا برا معلوم نہ ہوتا۔ ستم تو یہ ہوا کہ میر نے اپنے ساتھیوں کی تحقیر نہایت رکیک اور مبتذل انداز میں کی۔

ذیل کے اشعار میں انھوں نے اپنے معاصرین کو کتنی نفرت کے ساتھ پھٹکارا ہے۔

مری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے	جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے
کہاں پہنچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر	گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

ان اشعار کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے مخاطب شعرا بھی ان سے ناراض ہو گئے۔ اور سامعین نے بھی اس طرز کو پسند نہ کیا۔

لہ میر تقی میر، کلیات میر، مرتبہ عبادت بریلوی کراچی فروری ۱۹۵۸ء ص ص ۷، ۱۰۳۰ تا ۱۰۳۱

محمد امان نثار بہت ہی زود گو اور برجستہ کہنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے یہ رنگ دیکھ کر موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ فوراً ذہن ایک طرف بیٹھ کر ایک شعر موزوں کیا اور اسی مشاعرے میں پڑھ دیا۔ اس شعر پر چاروں طرف سے قہقہے اڑے۔ اور میر تقی میر کی بہت زیادہ سبکی ہوئی وہ شعر یہ تھا۔

جب مدد کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کر

میر قدرت اللہ قاسم نے بھی مجموعۂ نغز میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔
"بمجلس سخن طرازی در حین انشاد اژدرنامہ بہ محمد تقی میر طرف گردیدہ۔ و غزلے بدیہہ در توصیف میر کہ مقطع آں بجائے خود سمت گذارش یافتہ بر خواند (بہ) تحسین اہل مجلس را رسیدہ"۔ ۱؎

آزاد نے لکھا ہے کہ "محمد امان نثار، میر صاحب کے شعروں پر ہمیشہ شعر کہا کرتے تھے"۔ ۲؎ یہ بھی ان کی باہمی نوک جھونک کی وجہ ہو سکتی ہے۔
میر نے کہا تھا۔

بھوؤں تئیں تم جس دن صبح نکلے تھے ایک چیرا
اس دن ہی تمھیں دیکھے ماتھا مرا ٹھنکا تھا

۱؎ قدرت اللہ قاسم، مجموعۂ نغز، مرتبہ محمود شیرانی، لاہور، ۱۹۳۳ء، ص ۲۶۶

۲؎ آب حیات، ص ۲۲۳

نثار نے کہا۔

ہم آگے ہی سمجھے تھے وہ گھر کو سدھاریں گے
جس وقت گجر یا جا تھا۔ ماتھا مرا ٹھنکا تھا

میرؔ نے شعرائے اردو میں انہیں کوئی جگہ نہیں دی۔ اور نکات الشعرا میں اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ جب کہ وہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ اور دوسرے تذکرہ نگار بھی ان کی زود گوئی اور مشاقی کی تعریف کرتے ہیں۔ میر حسن لکھتے ہیں۔

"کار ریختہ و غزل را بہ خوبی و ہر بیت بہ سرانجام می رسانند" [1]

مصحفی لکھتے ہیں۔

دیوانِ ضخیمے ترتیب دادہ قدرتِ پُرگوئی بسیار دارد و اکثر در مشاعرہ ہائے دہلی ہم طرح یاران بود" [2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ نے ان کے سلسلے میں تعصب سے کام لیا ہے۔ میرؔ ان کے استاد حاتمؔ کے متعلق بھی کوئی اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ نثار بھی حاتمؔ اور میرؔ کی باہمی رنجش کا شکار ہو گئے ہوں۔ بہر حال معرکہ کا منظر تو مشاعرے میں دیکھنے کو ملا۔ اگر اس کے علاوہ بھی کچھ اور مناظر ہوں تو وہ ابھی پردۂ اخفا میں ہیں۔

.....

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۸۳

[2] مصحفی، تذکرہ ہندی، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء، ص ۲۵۶

یقین، انعام اللہ خاں

نام انعام اللہ خاں تھا اور تخلص یقین۔ ان کے دادا حضرت شیخ عبدالاحد نقشبندی اور نانا نواب حمیدالدین خاں تھے۔ یہ شیخ عبدالاحد المعروف بہ شاہ وحدت وہی شخص ہیں جن کی خدمت میں میر تقی میر حاضر ہوئے تھے۔ اور جن کا حال انھوں نے نکات الشعراء میں انعام اللہ خاں کے حالات کے ضمن میں کیا ہے۔ یقین کے والد کا نام شیخ اظہرالدین تھا۔ جو سرہند چھوڑ کر دہلی آگئے تھے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں نواب مبارک جنگ۔ بہادر کے خطاب اور ہزاری منصب کے ساتھ محمد شاہ بادشاہ کے طبقۂ امرا میں داخل ہو گئے تھے۔ یقین بقول فرحت اللہ بیگ ۱۱۴۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ ایک شکیل، وجیہہ، خلیق اور شیریں زبان شخص تھے۔ شادی ہو گئی تھی ان کے تین لڑکے تھے۔ جن کے نام یہ ہیں۔ مرزا حسین خاں مرید۔ صمصام اللہ خاں اختر، مقبول نبی خاں مقبول۔ یقین کو افیون کھانے کا چسکا پڑ گیا تھا۔ افیون کی تعریف میں کہتے ہیں

ہیں یار سیاہ زلف کے کاٹے سے کیا ہووے
کہ ہم اک عمر سے عادی ہیں خال لب کی افیون کے

لہ فرحت اللہ بیگ، دیوان یقین، ص ۱۰ تا ۳۲ سے حالات زندگی اخذ کیے گئے۔

فرحت اللہ بیگ کے خیال میں خواجہ میر زند کے خاندان میں ان کی شادی ہوئی۔ ان کے والد نے ان کو کسی وجہ سے قتل کر دیا تھا۔ اس راز کا پتہ نہ چل سکا۔ ان کو مرزا مظہر جان جاناں سے تلمذ تھا۔ اور ان سے کمال عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی تعریف میں کہتے ہیں۔

جوں نماز اپنے پہ صبح و شام لازم کر یقیں
حضرت استاذ یعنی شاہ مظہر کی ثنا

یقین ۲۵ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہاتھوں سے مارے گئے۔

یقین اور میر کے حالات کو سمجھنے میں تذکرہ نکات الشعرا ہماری مدد کرتا ہے۔ اس میں میر نے یقین کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں وہ یقین اور ان کے اجداد کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"یقین تخلص، شاعر ریختہ صاحب دیوان، از بسکہ اشتہار دارد، محتاج بہ تعریف و توصیف نیست، تربیت کردہ مرزا مظہر است۔ پدرش اظہار الدین خاں نام دارد۔ باعیدش در سر سنہ ملاقات کردہ بودم۔ بسیار آدم بامزہ یافتہ، بہ سلوک پیش آمدہ، وضیافت فقیر کردہ، تا دیر نشستہ صحبت مستوفی داشتم شعر فارسی بہ طرز می گوید" اس کے بعد وہ اپنے مطلب پر آتے ہیں۔

یہاں وہ یقین کے اخلاق اور اس کی شاعری پر تنقید کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

"بیان یقین را مردمان می گفتند کہ مرزا مظہر او را شعر گفتہ میدہد و لیکن شعر ہائے ریختہ خود گردانیدہ، از قبول کردن این معنی بندہ را خندہ می آید کہ ہمہ چیز بوارث میرسد الا شعر۔ مثلاً کسے بہ شعر پدر خود یا بر مضمون او متصرف شود، ہمہ کس او را دزد خواہند گفت، تا بہ شعر استاد چہ رسد۔ القصہ

پیرد پوچ چندے بیگنہ یافتہ است کہ ما دشمانیز می توانم یافت۔ ایں قدر بر خود چیارہ است کہ رعونت فرعون پیش او پشت دست برزمین گمراود۔ بعد از ملاقات ایں قدر خود معلوم شد کہ ذائقۂ شعرفہمی مطلق ندارد۔ شاید از ہمیں راہ مردمان گمان ناموزونیت درحق او داشتہ باشند۔ جمع برایں اتفاق دارند کہ شاعری او خالی از نقص نیست، چراکہ شاعر ایں قسم کم فہم نمی باشد۔ از شخصے منقول است کہ بجائے عطیۃ اللہ کہ پسر نواب عنایت اللہ خاں مرحوم باشد یقین نشستہ بود و می گفت ازاں روز یکہ مرزا دست استادی بر سر من داشتہ است شعر من ترقی کردہ۔ شخص مذکور۔ ایں مصرع نظامی پیش حضار مجلس بآواز بلند خواند مصرع:۔

شد آں مرغ کو خایۂ زریں نہاد

حاصل او را بیضہ در کلاہ شکست میاں شہاب الدین ثاقب کہ احوال او نوشتہ خواہد شد نقل می کرد کہ من محض برائے امتحان بخانۂ او رفتم و یک غزل طرح کردم۔ من غزل بانصرام رسانیدم دا ز مصرعے موزوں نشدہ واللہ عالم۔ میاں محمد حسین کلیم کہ احوالش گذشت قصیدہ گفتہ است مسمی بہ روضۃ الشعراء و در وہ نام تمام شعراء را نقل کردہ ازاں جملہ نام ایشاں را نیز آوردہ۔ لیکن بجائیکہ بیع غریبے کہ سخن فہم می نہمدد آں ایں است۔

یقیں کہ شعر دں پر ہیں بدگماں بعضے کہ اس کے تہیں

غلط ہے ہم نے بوجھا ہگا مرزا جان جاناں کو

نام مرزا، جان جلل است و شاعر جان جاناں بستہ، چوں اکثر عوام نام مرزا از غلطی جان جاناں می گویند شاعر مذکور نظر بر شہرت بھچنیں موزوں کردہ، اگرچہ نمی بایست کہ گفتگوئے ما با خواص است، در بزرگ زادگی و شرافت

و نجابت میاں یقین سخنے نیست "۔ لے

یہ تو یقین کے بارے میں میر کی رائے تھی اب دوسرے تذکرہ نگاروں کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیں۔ مصحفی کہتے ہیں۔

"در دورہ ایہام گویاں لوں کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جوان بود۔ بعد از اں تتبعش بدیگراں رسیدہ "۔ لے

حکیم سید احمد علی خاں یکتا فرماتے ہیں۔

"در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را بر وضع فارسی گویان شستہ و رفتہ گفت ایں بزرگ بود"۔ سے

قائم لکھتے ہیں۔

"صدر نشین بزم شعرائے متاخرین۔ انعام اللہ خاں یقین شاعر صاحب طرز یگانہ عود وحید دہر است"۔ سمہ

گردیزی نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

"شہباز خیالش با صید معنی بلند پرواز است و ہمائے اندیشہ اش بر قلۂ قاف سخن بہ پر فشانی ممتاز بے اغراق ریختہ گوئی را بہ طاق بلند گذاشتہ و تخم معنی در زمین سخن کاشتہ و آنچہ از طبعش سرزدہ از فرط شیوع حسن قبول در تمام ہندوستان بر افواہ السنہ جاری است"۔ ھہ

لہ نکات الشعرا، ص ۸۱

لہ تذکرۂ ہندی، ص ۲۷۵

سہ دستور الفصاحت، ص ۶۹

سمہ مخزن نکات، ص ۳۴

ھہ گردیزی، تذکرہ ریختہ گویان ہند، مرتبہ عبدالحق اورنگ آباد ۱۹۳۳ء، ص ۱۴۶

یہ بیانات وہ تھے جن میں یقین کی مقبولیت اور اس کی شاعری کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اب اس کے بعد ان لوگوں کے بھی خیالات سنئے جنھوں نے میر کی تنقید کو الزام تراشی اور بہتان سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس ناانصافی پر انھیں ملامت بھی کی ہے۔

میر قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں۔

"شاعر بے نظیر محمد تقی میر در تذکرہ خود قلمی نمودہ کہ دیوان دے ازاں مرزائے مغفور است۔ افترائے محض و کذب خالص است کہ از ثمر حسد از دے سرزد اکثر غزلہا بارہا بہ حضور سراپا سرور آگاہ رموز خفی و جلی بسید فتح علی خاں حسینی نام ظلہم، گفتہ بلخص کلام دے شاعرے بود۔ فصاحت آئین بلاغت آگین، شیریں زبان عذب البیان نکتہ سنج معانی را گنج طرز نوے بدستش افتادہ انداز جدید را رونق تازہ دادہ ہمیشہ غزل پنج بیتی می گفت"۔ [۱]

میر قدرت اللہ نے میر کی الزام تراشی کا سبب ان کا جذبہ رشک و حسد بتایا ہے۔ چمنستان شعراء کے مصنف شفیق نے تو یقین کے ساتھ کمال عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے اور ہندوستان کے شاعروں میں کسی کو بھی اس کی ٹکر کا نہیں سمجھا۔

ڈاکٹر عبدالحق نے چمنستان شعراء کے دیباچے میں لکھا ہے۔

(یعنی شفیق) کہتا ہے۔ "اگرچہ مرزا سودا کی غزل، مخمس، مثنوی، قصیدے قطعہ وغیرہ میں بڑا رتبہ ہے۔ اور وہ بہت اعلیٰ تلاش کرتے ہیں۔ لیکن یقین کے ریختہ میں کچھ اور ہی فصاحت و بلاغت ہے۔

---

[۱] مجموعۂ نغز، ص ۲۵۵

اگر ہزار برس تک یہ میرزا سودا
کرے جو فکر تتبع یقین کا از دل و جاں
کہے گا معنی باریک و خوب و شیریں تر
وے نزاکت و یہ لطف و یہ قبول کہاں

وہ یکتائے عصر اور یگانۂ زمانہ ہے۔ اور ایسا نکتہ رس معنی آفریں اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے میں جو یقین پر طعن و تعریض کی ہے اور اسے مبتذل بند کہا ہے اور سرقے کا الزام لگایا ہے تو اس پر شفیق آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور میر صاحب کو خوب سخت و سست کہتا ہے۔ سودا نے جو میر کی ہجو کہی تھی۔ اس کو نقل کر کے اس کی داد دیتا ہے۔ اس کے بعد توارد اور سرقہ پر بحث کی ہے۔ دوسرے علماء کے اقوال نقل کئے ہیں۔ اور خود اپنا قطعہ بھی جو اس مضمون پر لکھا ہے نقل کیا ہے۔ غرض میر صاحب کے خلاف خوب زہر اگلا ہے اور خود میر صاحب کے ذکر میں ان کی حرف گیری پر چوٹ کی ہے۔" [1]

اس کے بعد یہ صورت حال لوگوں کی دلچسپی کا باعث بن گئی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے یقین کا دیوان مرتب کیا۔ اور اسی کے حالات میں ان تمام چیزوں کا جائزہ لیکر ثابت کیا ہے کہ در اصل یہ میر کی ذاتی رنجش کا نتیجہ تھا۔ اور یہ رنجش اس وقت پیدا ہوئی جب انھوں نے یقین سے ملاقات کی تھی۔ فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں۔

"یہ (یعنی میر) جا کر یقین کے دادا سے ملے وہ ان کے ساتھ برابری

---

[1] لچھمی نرائن شفیق، چمنستان شعراء، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو، ہند ۱۹۲۸ء ص ص ۱۴، ۱۵

سے پیش آئے۔ دعوت کی۔ شعر و شاعری ہوئی۔ یہ سر ہند سے خوش خوش آئے
اور شیخ عبدالاحد کی تعریف اپنے تذکرے میں بے ضرورت کر دی۔ اب یہ یقین
سے ملتے ہیں۔ وہ سرہند کے فقیر کا گھر تھا۔ یہ دہلی کے ایک امیر کا محل ہے۔
وہاں ایک جہاندیدہ بزرگ تھے۔ اور یہاں ایک نوجوان لڑکا۔ وہاں انکساری
تھی یہاں مرزا منشی، اور نازک مزاجی، وہاں کسی کو برابری کا دعویٰ نہ تھا۔ اور
یہاں یہ زور تھا کہ ؎

یقین تا مدحق سے شعر کے میداں کا رستم ہے
مقابل آج اس کے کون آسکتا ہے کیا قدرت

بھلا ایسی صورت میں میر صاحب کا سرہندہ الا رنگ ڈھونڈنا تحصیل حاصل
تھا۔ ان کے کسی شعر کی تعریف نہ کی ہوگی۔ جو یقین کو کم فہم ٹھہرا کر صلواتیں سنانے
پر اتر آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ملاقات کی وجہ سے یہ خیالات یقین کے متعلق ظاہر
کئے گئے ہیں۔"[1]

مرزا فرحت اللہ نے جو وجہ مخاصمت بیان کی ہے اس سے بہ حیرت
ہوتی ہے کہ میر جیسا بڑا شاعر ایک نو عمر لڑکے کی بات کا اس قدر برا کیوں
مانا۔ اور اس کی سرد مہری کو اتنی شدت کے ساتھ کیوں محسوس کیا۔ حالانکہ
وہ اس کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر خلیق انجم کی تحقیق نے اس
معمہ کو حل کر دیا۔ اور یہاں ہم انھیں کی رائے سے اتفاق کریں گے۔
وہ انعام اللہ خاں یقین اور میر کی وجہ مخاصمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔
" اصل میں شاعروں کے دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک گروہ شاعروں

---

[1] فرحت اللہ بیگ، دیوان یقین، ص ص ۳۷، ۳۸

کی پہلی نسل سے تھا۔ جس میں میر جیسے کچھ نوجوان بھی شریک تھے۔ ان میں میر اور دوسرے چند شاعروں کے سوا باقی سب ایہام گو تھے۔ اس گروہ کی سرپرستی خان آرزو اور نمایندگی میر کرتے تھے۔

دوسرا گروہ شاعروں کی دوسری نسل کا تھا۔ جس میں ایہام کے مخالف شاعر تھے۔ سب شاعر نوجوان تھے۔ اس گروہ کی سرپرستی مرزا مظہر اور نمایندگی انعام اللہ خاں کرتے تھے۔

اس گروہ بندی اور مخاصمت کی وجہ مرزا مظہر کی ایہام کے خلاف تحریک تھی۔ مرزا نے جس زمانے میں اس تحریک کا آغاز کیا ایہام کی مقبولیت اپنے عروج پر تھی۔ ابتدا میں شاید انھیں کامیابی نہیں ہوئی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد انکی طرز جدید کی مقبولیت شروع ہو گئی۔ ان کی مقبولیت ایہام گو شعرا کے لئے مستقل خطرہ بن گئی۔ کافی عرصہ تک ہندوستان میں ان کا ڈنکا بجا تھا۔ اس میں سے بعض کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے اور اب ان کی شہرت اور مقبولیت کو کاری ضرب لگ رہی تھی۔ یہی وجہ مخاصمت تھی۔ چونکہ میر بھی اس گروہ میں شامل تھے اس لئے یقین کے ساتھ اسی بنا پر دشمنی ہو گئی" [1]

یہ تو یقین کے ساتھ میر کی رنجش کا سبب ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے یقین کو گرانے کے لئے جو کچھ کیا وہ نکات الشعرا کے بیان سے ظاہر ہے۔ مرزا مظہر کے گروہ کے باقی اور شاعروں کے ساتھ بھی انھوں نے غالباً یہی سلوک کیا۔ [2] مرزا مظہر کی ریختہ گوئی کا انھوں نے مطلق ذکر نہیں کیا۔

---

[1] خلیق انجم مقالہ مظہر جان جاناں، دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۰ء ص ۱۳۱

[2] نکات الشعرا ص ۱۱۷

جبکہ بقول ان کے خود یقین کا پورا دیوان انھوں نے کہہ کر دیا تھا۔ وہ دردمند کے متعلق کہتے ہیں۔ "ہر چند کہ یک ملاقات باد کردہ بدام لیکن خوب از احوالش مطلع نیستم این قدر دانم کہ نظر یافتہ مرزا مظہر سلمہ است و اشعار او ہم بگوش فقیر نہ رسیدہ مگر چند بیت" ساقی نامہ "کہ مصرع ... گفتہ" حزیں کے متعلق لکھا "از بصیریان مرزا جان جاں مظہر شنیدہ می شود کہ بہ بنگالہ رفت۔ دیگر احوالش تحقیق نمی گردد" [2] بیان کا بھی میر نے تذکرہ نہیں کیا بلکہ انھیں کے ساتھ شیخ غلام احمد منشی، ساون لال بیدار، ہیبت قلی خاں اور حسرت وغیرہ بھی اسی تعصب کا شکار ہو گئے۔

اس کے مقابلے پر انھوں نے خان آرزو گروہ کے شاعروں کو کافی سراہا۔ جبکہ یہ ایہام گو تھے۔ اور خود میر ایہام گوئی کے حق میں نہ تھے۔ ان میں مضمون آیرو یک رنگ کی خاص طور پر تعریف کی ہے۔ علاوہ ازیں آرزو کے ان شاگردوں کو بھی قابل ذکر سمجھا ہے جو بالکل معمولی شاعر تھے۔ وہ ہیں شہاب الدین ثاقب۔ حسن علی شوق اور آنند رام مخلص۔

خان آرزو سے ذاتی رنجش ہونے کے باوجود بھی انھوں نے نکات الشعرا میں ان کو پیر و مرشد کہا۔ لیکن ذکر میر میں جو نکات الشعرا کے بعد لکھی گئی اس میں آرزو کو اپنا استاد تسلیم نہیں کیا۔ اس تضاد کی وجہ بھی یہی معارضہ مظہر آرزو تھا۔ میر کی ابتدا میں کوئی ادبی حیثیت نہ تھی اس لئے انھیں آرزو کا سہارا لینا پڑا اور مصلحتاً استاد کہنا پڑا۔ میر خود ذہنی اعتبار سے

---

[1] نکات الشعراء ص ۱۱۷

[2] ایضاً ص ۱۰۴

مرزا گروہ کے ساتھ تھے۔ مگر حالات نے انھیں آرزو کے قریب کر دیا تھا۔ اور یہ بہت مشکل تھا۔ کہ وہ آرزو کے ساتھ رہتے ہوئے مظہر گروہ میں شامل ہو جائیں بعد میں جب میرؔ کو شہرت حاصل ہو گئی تو انھوں نے ذکر میر میں انھیں استاد تسلیم نہیں کیا۔

میرؔ کے مقابلے میں یقین کا یہ عالم تھا کہ وہ فضائے ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ بقول خلیق انجم "۱۱۵۲ھ اور ۱۱۶۰ھ کے درمیان یقین کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل رہی۔ میرؔ اور سوداؔ کے چراغ بھی یقین کے سامنے روشن نہ ہو سکے۔"[1] خود گلشن گفتار میں حمید اورنگ آبادی نے یقین کی مقبولیت کا اعتراف کیا ہے۔ اور میر کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہ تذکرہ غالباً ۱۱۶۵ھ میں لکھا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرؔ نے یقین کے خلاف ہر ممکن حربہ استعمال کیا انھوں نے پہلے تو مختلف شہادتیں دے کر ثابت کر دیا کہ یقین کا پورا دیوان مرزا مظہر کا لکھا ہوا تھا اور خود ایک مصرع موزوں نہیں کر سکتے تھے۔ پھر کہا ہے ان میں شعر فہمی کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ اور ان کی شاعری نقص سے خالی نہیں۔ آخر میں ان پر سرقہ کا الزام بھی لگا دیا۔

یقین کا ایک شعر ہے۔

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند
برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

اس کے متعلق کہتے ہیں۔۔

"شعر یقین لفظاً متبدل آنندرام مخلص است کہ گزشت

---

[1] خلیق انجم، مقالہ مظہر جان جاناں، دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۰ء، ص ۱۳۴

طرفہ تر ایں کہ آں ہم در سلیقۂ سرقہ بیکہ بودہ است ۔ خدا داند کہ ایں معنی دراصل از کیست ۔ شعر ایں است ۔

ناخن تمام گشت معطر چوں برگ گل
بند قبائے کیست کہ وا می کنیم ما "[۱]

لیکن اب یہ حقیقت منکشف ہو چکی ہے کہ یہ محض میر کا غبار کدورت تھا اور واقعہ نہ تھا ۔ نہ ان کا دیوان مرزا مظہر نے کہا تھا نہ وہ ذوق شعر فہمی سے عاری تھے ۔ نہ وہ سرقہ کرتے تھے ۔ بلکہ اپنے دور کے مقبول و معروف شاعر تھے ۔

---

[۱] نکات الشعرا ۔ ص

اختتامیہ

میر اردو کے عظیم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری ان تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے جو ادب عالیہ کے لیے ضروری ہیں۔ میر کی انسان دوستی، ان کی دردمندی اور اپنے دور کا بھرپور اجتماعی احساس ان کی شاعری کو ایک بلند مقام عطا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے لہجے کی انفرادیت، ان کی عاشقانہ زندگی کا سوز و گداز اور ان کا جذباتی آہنگ ان کے کلام میں دلکشی اور طرفگی و تازگی کو سدا بہار بنا دیتا ہے۔ ابھی تک میر کی شاعری میں انھیں اقدار کو تلاش کیا گیا ہے۔ اور ان پر زور بھی دیا گیا ہے۔ لیکن جب ہم میر کے اس ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جو ان معرکوں کے زیر اثر وجود میں آیا ہے تو میر کی شخصیت کے بعض کمزور پہلو بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

اس ادب میں نہ تو ان کا وہ لب و لہجہ ملتا ہے اور نہ وہ دردمندی نظر آتی ہے جس نے میر کو بقائے دوام بخشا بلکہ بقول ڈاکٹر فاروقی "بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو میر ہیں۔ ایک کی غیرت، حمیت، شرافت، کشادہ قلبی اور پاک مشربی کی انتہا نہیں دوسرا بے دماغ اور مغرور ہے۔ وہ اپنے آگے کسی کو نہیں سمجھتا۔"[1] میر نے اپنے حریفوں کے حالات میں جو کچھ سپرد قلم کیا ہے۔ اس سے

---

[1] میر تقی میر، حیات اور شاعری ص ۱۴۳

ان کی زہرناکی، اور عداوت کا پتہ چلتا ہے۔ یہی حال ان کی تنقید کا بھی ہے۔
میر نے اپنے معاصر شعراء کی تحقیر و تذلیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ان کی ہجویات
میں ابتذال، رکاکت اور فحش نگاری بدرجۂ اتم موجود ہے، بقا، حجام اور سودا
خاص طور سے ان کی لعن طعن کا نشانہ بنے رہے۔ ان ہجویات میں نہ تو کوئی ادبی
حسن ہے اور نہ طنز و مزاح کی وہ طرفگی موجود ہے جس سے سامعین و قارئین
کے دل میں بھی گدگدی پیدا ہو سکے۔ ان کے لب و لہجہ میں انتہائی نفرت، غم و غصہ
اور برافروختگی شامل ہے۔ جس سے ان کے طنز بیکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور سوائے
پھکڑپن اور طعن و تشنیع کے کچھ نظر نہیں آتا۔ تنقید میں بھی یہی حال ہے۔ جن
لوگوں سے ذرا بھی اختلاف تھا ان کی شاعری کو بیکار ثابت کر دیا۔ کسی پر سرقے
کا الزام عائد کر دیا۔ کسی کو ناموزوں قرار دے دیا۔ کسی کے کلام کو پست بنا دیا۔
اس ضمن میں انعام اللہ خاں یقین، حاتم، حشمت، قائم وغیرہ کے نام
لئے جا سکتے ہیں۔ بہت سے قابل ذکر شعراء کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔
ان میں بقا اللہ بقا، محمد امان نثار، عنایت اللہ حجام، میر سوز اور بیان وغیرہ
آجاتے ہیں۔

نکات الشعراء میں میر نے تعصب سے بھی کام لیا ہے۔ اور انتہا پسندی
سے بھی۔ اور بعض لوگوں کے حق میں رواداری بالکل نہیں برتی بلکہ ایسی بیدردی
سے کام لیا ہے جو تنقید کی سنجیدگی اور تدبیر کی اصابت رائے کو مجروح کر دیتی
ہے۔ حاتم کے اشعار کی اصلاح اور یقین کے متعلق اظہار خیال اس کا بین ثبوت
ہیں۔

میر جس زمانے میں تھے۔ اس زمانہ کا یہی تنقیدی معیار تھا۔ عام طور پر
شخصی اثرات اور ذاتی حیثیت مدنظر ہوتی تھی۔ اخلاق و سیرت کو ادب سے

بند نہیں رکھا جاتا تھا۔ اور نہ ہر چند چیزوں کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا جاتا تھا۔ اسی لئے میر نے شاعری جیسے فن شریف کے دروازے کم تر لوگوں کے لئے بند کر رکھے تھے۔

ان معرکوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شعر میں نفس مضمون سے زیادہ الفاظ اور پیرایہ اظہار پر زور دیا جاتا تھا۔ فن عروض اور اس کے بندھے ٹکے ضابطوں کی پابندی شاعری کے لئے ضروری خیال کی جاتی تھی۔ چنانچہ نئی ترکیب کے استعمال اور نئے استعارے کی ایجاد پر سند طلب کی جاتی تھی۔ لیکن میر نے اپنی تنقیدوں میں نفس مضمون کا خیال رکھا ہے اور انسان دوستی اور دردمندی کو قدر کی حیثیت سے قبول کیا ہے۔ انھوں نے طرز اور اسلوب پر زور دیا۔ اور اخلاقی قدروں کے فقدان کو پاجیانہ گفتگو سے تعبیر کیا۔

مجموعی طور پر میر کا وہ ادب جو معرکوں میں تخلیق ہوا ہے۔ وقتی رنجش کا گرد و غبار ہے۔ اس میں نہ ان قدروں کی جھلک ہے جو میر کو عزیز تھیں۔ نہ ان کے انداز میں وہ دل کشی ہے جو ان کے آرٹ کا طرۂ امتیاز تھی۔ البتہ ان کی ہجوؤں کا پورا ماحول اس دور کے روبہ زوال معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس زمانے میں فحش گوئی اخلاقی عیب نہ تھا۔ نہ کوئی چھوٹا بڑا آدمی اسے خلاف تہذیب سمجھتا تھا۔ نواب امرا بھی ہاتھا پائی اور گالی گلوچ کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ایک طرف آداب مجلسی کا یہ احترام تھا کہ بزرگی یا ہم رتبہ ہونے کا ہر جگہ خیال رکھا جاتا تھا۔ دوسری طرف ذاتی رنجش اور پرخاش کا یہ عالم تھا کہ اخلاق و تہذیب کو بھی بالائے طاق رکھ دیا جاتا تھا اور اس میں تنہا میر ہی نہیں بلکہ شرفا امرا بھی ملوث تھے۔

میر کے ادبی معرکوں کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ایک طرف میر کی شخصیت کے مطالعے میں ہماری مدد کرتے ہیں، اور دوسری طرف ان تعلقات پر روشنی

ڈالتے ہیں۔ جو میر اپنے ہم عصر شاعروں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ میر کی بے دماغی کے اکثر تذکرہ نگار شاکی ہیں۔ ان ادبی معرکوں میں اس بے دماغی کے مکمل ثبوت مل جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انسان جتنا علم و فن حاصل کرتا ہے۔ اتنی ہی اس میں خاکساری اور انکساری آجاتی ہے۔ میر کے سلسلے میں یہ قول درست نہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ میر اپنے عہد کے عظیم شاعر ہیں۔ لیکن اس عظیم شاعر کی شخصیت کے بعض کمزور پہلو بھی ہیں۔ سودا، قائم اور دوسرے شعراء سے میر کے ادبی معرکوں کو معاصرانہ چشمکیں کہہ سکتے ہیں۔ لیکن شواہد موجود ہیں کہ میر نے اپنی بزرگی بالائے طاق رکھ کر محمد امان نثار، بقار اللہ، مجذوب اور ایسے ہی دوسرے نوجوان شعراء سے معرکے کئے۔ مثنوی "اژدر نامہ" میر کی بد دماغی، خود سری اور غرور فن کا بیّن ثبوت ہے۔

اس مقالے میں میر کے ادبی معرکوں کا مطالعہ اسی خیال سے کیا گیا ہے کہ اردو کے ایک عظیم شاعر کی شخصیت کے دوسرے رخ کے کچھ پہلو ہمارے سامنے آجائیں تاکہ ہم میر کی شخصیت اور فن کو بہتر طریقے سے سمجھ سکیں۔

....

کتابیات

فارسی مطبوعات

۱۔ میر، میر تقی، نکات الشعراء، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء

۲۔ میر، میر تقی، ذکر میر، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء

۳۔ میر، میر تقی، فیض میر، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، نظامی پریس، وکٹوریا اسٹریٹ لکھنؤ ۱۹۲۹ء

۴۔ حمید اورنگ آبادی، خواجہ خان، گلشن گفتار، مرتبہ سید محمد، سلسلۂ مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ ۱۳۲۹ف

۵۔ فتح علی حسینی گردیزی، سید، تذکرہ ریختہ گویاں، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء

۶۔ حسن، میر حسن، تذکرہ شعرائے اردو، مرتبہ محمد حبیب الرحمن خاں شیروانی، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد ۱۹۴۰ء

۷۔ قائم، شیخ محمد قیام الدین، مخزن نکات، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد ۱۹۲۹ء

۸۔ شفیق، لچھمی نراین، چمنستان شعرا، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء

۹۔ مصحفی، غلام ہمدانی، تذکرہ ہندی، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۳ء

۱۰۔ مصحفی، غلام ہمدانی، عقد ثریا، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۳۴ء

۱۱۔ مصحفی، غلام ہمدانی، ریاض الفصحا، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن طبع اول ۱۹۳۴ء

۱۲۔ سرور، میر محمد خاں بہادر، عمدۂ منتخبہ، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی، ۱۹۶۱ء

۱۳۔ شورش عظیم آبادی، تذکرہ شورش (دو تذکرے) مرتبہ کلیم الدین احمد، دو جلدیں۔ بیبل لیتھو

پریس، پٹنہ، پہلی جلد ۱۹۵۹ء دوسری جلد ۱۹۶۳ء

۱۴۔ عشقی عظیم آبادی، تذکرہ عشقی (دو تذکرے) مرتبہ کلیم الدین احمد، دو جلدیں بیبل لیتھو پریس، پٹنہ، پہلی جلد ۱۹۵۹ء دوسری جلد ۱۹۶۳ء

۱۵۔ یکتا، حکیم احمد علی خاں، دستور الفصاحت، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، سلسلہ مطبوعات کتب خانہ ریاست رامپور ۱۳۴۳ء

۱۶۔ قاسم، حکیم قدرت اللہ، مجموعہ نغز، جلد اول، مرتبہ محمود شیرانی سلسلہ نشریات کلیہ پنجاب لاہور، ۱۹۳۳ء

۱۷۔ قاسم، حکیم قدرت اللہ، مجموعہ نغز، جلد اول دوم مرتبہ محمود شیرانی سلسلہ نشریات کلیہ پنجاب، لاہور، ۱۹۳۳ء

اردو مطبوعات

۱۸۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد دوم مطبع معارف، اعظم گڈھ

۱۹ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد سوم، شیخ مبارک علی تاجر، لاہور، ۱۹۲۴ء

۲۰۔ عبد السلام ندوی، شعر الہند، جلد اول۔ مطبع معارف اعظم گڈھ، ۱۹۳۹ء

۲۱۔ لطف، مرزا علی، گلشن ہند، مرتبہ مولوی شبلی اور مولوی عبد الحق، رفاہ عام، اسٹیم پریس لاہور ۱۹۰۶ء

۲۲۔ آزاد، محمد حسین، آب حیات، رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور، بار ہشتم، ۱۹۱۳ء

۲۳۔ سری رام، لالہ، خمخانہ جاوید، جلد چہارم، یار اول، ہمدرد پریس دہلی، ۱۹۲۶ء

۲۴۔ سید عبد اللہ، نقد میر، جہانگیر بک ڈپو، دہلی

۲۵۔ خواجہ احمد فاروقی، میر تقی میر حیات اور شاعری، انجمن ترقی اردو علی گڈھ، ۱۹۵۷ء

۲۶۔ خواجہ احمد فاروقی، دیوان بقا، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی۔

۲۷۔ شیخ چاند، سودا، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء

۲۸۔ خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا، انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۶۶ء

۲۹۔ سودا، مرزا محمد رفیع، کلیات سودا۔ دو جلدیں، مرتبہ عبدالباری آسی، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۳۲ء

۳۰۔ میر، میر تقی، کلیات میر، مرتبہ عبادت بریلوی، سلسلہ مطبوعات اردو دنیا، کراچی ۱۹۵۸ء

۳۱۔ میر، میر تقی، میر کی آپ بیتی، مترجمہ نثار احمد فاروقی، مکتبہ برہان دہلی، ۱۹۵۷ء

۳۲۔ یقین، انعام اللہ خاں، دیوان یقین، مرتبہ فرحت اللہ بیگ، مطبع مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۱۹۳۰ء

۳۳۔ قاضی عبدالودود، عیارستان، سلسلۂ مطبوعات ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ، ۱۹۵۷ء

۳۴۔ رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، اردو ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد

۳۵۔ رنگین، سعادت یار خاں، مجالس رنگین، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۲۹ء

۳۶۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری، راجہ رام کمار پریس لکھنؤ ۱۹۵۴ء

۳۷۔ مسیح الزماں، اردو تنقید کی تاریخ، الہ آباد، ۱۹۵۴ء

۳۸۔ شفق، رضا زادہ، تاریخ ادبیات ایران، مترجمہ مبارز الدین رفعت، حیدرآباد ۱۹۴۶ء

۳۹۔ ہاشمی نصیر الدین، دکن میں اردو، لاہور، ۱۹۴۰ء

۴۰۔ فائق، کلب علی خاں، حیات میر

۴۱۔ نیر مسعود، رجب علی بیگ سرور، حیات اور کارنامے، شعبۂ اردو۔ الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، ۱۹۶۷ء

۴۲۔ سید عبداللہ، شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۲ء

۴۳۔ سرور، رجب علی سرور، فسانۂ عجائب، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۵۴ء

۴۴۔ زیات، استاد احمد حسن، تاریخ ادب عربی، مترجمہ عبدالرحمٰن طاہر سورتی، الشیخ

غلام علی اینڈ سنز، کشمیری بازار لاہور
۴۵۔ صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، جرأت انکا عہد اور عشقیہ شاعری، اردو اکیڈمی سندھ، بندر روڈ کراچی، مئی ۱۹۵۲ء

قلمی (اردو)

۴۶۔ خلیق انجم، مرزا مظہر جان جاناں، تحقیقی مقالہ، دہلی یونیورسٹی لائبریری

رسالے (اردو)

۴۷۔ اردوئے معلیٰ، قائم نمبر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی،
۴۸۔ اردوئے معلیٰ، میر سوز نمبر، شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی دہلی،
۴۹۔ دلی کالج اردو میگزین، میر نمبر، دہلی
۵۰۔ نقوش۔ طنز و مزاح نمبر۔ لاہور فروری ۱۹۵۹ء
۵۱۔ اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ
۵۲۔ اردو، سہ ماہی، اپریل ۱۹۶۶ء جلد ۴۲۔ شمارہ ۲، انجمن ترقی اردو، کراچی
۵۳۔ علی گڑھ میگزین، ۱۹۵۷ء علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشاریہ

الف

ب

ذ

Aurangzeb Qasmi Subject Specialist G.H.S.S Qasmi Mardan